پیسے کی کہانی

پیسے کی کہانی

غلام حیدر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1973
تیسری طباعت	:	2010
تعداد	:	550
قیمت	:	14/- روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	296

Paise ki Kahani

by

Ghulam Haider

ISBN :978-81-7587-366-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آ جاتی ہے۔ اس سے دار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آ جاتا ہے۔ یہ سب وہ یں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف انا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے یادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو رنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک ور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

۱۔ میں کون ہوں	۹
۲۔ جانوروں کے بھیس میں	۱۵
۳۔ اناج کے بھیس میں	۲۵
۴۔ سونا، چاندی، تانبا	۲۸
۵۔ دربار کی رونق	۴۶
۶۔ سستے سکے	۵۹
۷۔ کاغذی لباس	۶۶
۸۔ خوب صورت سکے	۷۰
۹۔ آج کی شکل	۷۸

میں کون ہوں

میں گول ہوں، میں چوکور ہوں، میں آٹھ کونوں والا بھی ہوں، ہوا میں اُڑ بھی سکتا ہوں، پانی میں ڈوب بھی سکتا ہوں، مگر میں چپٹا ضرور ہوں۔

لوگ میری گولائی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ میں لڑھک کر ہاتھوں سے نکل جاتا ہوں، میرے چپٹے پن کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ مجھے جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ مجھے بُرا بھلا بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ میں کسی کے پاس ٹھہرتا نہیں۔ مگر یہ بات غلط ہے — میں لوگوں کے پاس رکتا بھی ہوں، مگر انھیں کے پاس جو مجھے رکھنا جانتے ہیں۔ خیر چاہے لوگ مجھے کتنا بھی بُرا بھلا کہیں مگر دنیا کا ہر شخص مجھے چاہتا ضرور ہے۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے پریشان ضرور رہتا ہے۔ جس کے پاس میں پہنچ گیا وہ امیر کہلانے لگا اور جس کے پاس سے چلا گیا وہ غریب ہو گیا۔

تم سمجھے میں کیا ہوں۔؟

میں چمکتا، کھنکتا، جگمگاتا پیسہ ہوں۔ اور — ؟ اور روپیہ ہوں۔!!

اچھا، تم نے میری کتنی شکلیں دیکھی ہیں ؟

بہت سی ! چلو خیر، تم نے چھوٹا سا پیسے کا سکّہ دیکھا ہوگا، دو، تین، پانچ پیسے وغیرہ کے سکّے دیکھے ہوں گے۔ ایک، دو، پانچ روپے وغیرہ کے نوٹ

بھی دیکھے ہوں گے۔ اچھا، سو روپے کا ہرا ہرا خوب صورت سا نوٹ بھی دیکھا ہے! اور دس ہزار روپے کا نوٹ ؟ اگر نہیں دیکھا تو بس سمجھ لو کہ آج کل میری سب سے بڑی شکل یہی ہے۔ مگر یہ تو ایک ہی شکل ہوئی میری! جسے تم پیسہ یا روپیہ کہہ سکتے ہو۔

تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرے لگ بھگ ڈیڑھ سو بہن بھائی ہیں جو دنیا کے ملکوں میں الگ الگ ناموں سے لوگوں کے ہاتھوں میں جاتے ہیں۔ دو ایک ملکوں میں میرے بہن بھائی بالکل انہی ناموں سے بھی پکارے جاتے ہیں جن سے میں ہندوستان میں پکارا جاتا ہوں — جیسے برما اور پاکستان وغیرہ میں میرا یہی نام ہے — روپیہ!

یہ اور بات ہے کہ میرے یہ ہم نام بھائی میرے دیس میں اجنبی ہیں۔ تم کسی شخص کو میرا برمی بھائی دے دو، وہ فوراً لوٹا دے گا — "یہ ہمارا روپیہ نہیں ہے۔"

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ڈیڑھ سو بہن بھائی ہیں۔ ان سے کام لوگ ایک سا ہی لیتے ہیں مگر نام الگ الگ رکھ لیے ہیں اور دوسرے بھائی کی اتنی عزت بھی نہیں کرتے جتنی اپنے ملکی بھائی کی کرتے ہیں۔

پھر ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ لوگ میرے بزرگوں کو بھی میرا بھائی ہی سمجھتے ہیں۔ کچھ سال پہلے تم نے دیکھا تھا کہ میری شکل ذرا مختلف تھی — اصل میں وہ میں یا میرے بھائی نہیں تھے۔ وہ میرے بزرگ تھے ان کے نام تھے 'اکنی'، 'دوانی'، وغیرہ۔ کچھ دن ہوئے لوگوں نے انھیں پرانا سمجھ کر چھوڑ دیا۔ پہلے مجھے "نیا پیسہ" کہا، پھر کچھ دن بعد "نیا" ہٹ گیا

اور اب میں پھر "پیسہ" ہوں۔

اب جب میں نے اپنے متعلق بتانا ہی شروع کیا ہے تو تمھیں اپنی ایک کمزوری بھی بتا دوں۔ یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔

مجھ سے دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے مگر میں خود کسی کام کا نہیں — تم کہو گے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تم اپنے ابّا، امّی سے پیسے لیتے ہو اور بازار جا کر ان سے طرح طرح کی مٹھائیاں، کھلونے اور کتابیں خریدتے ہو پھر میں نہیں تو اور کون تمھارے کام آتا ہے؟

لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سچ پوچھو تو میں تمھارے لیے بالکل ضروری نہیں ہوں۔ ذرا یوں سوچو کہ اگر کوئی دکان دار مٹھائی، چاٹ، قلم، کاغذ وغیرہ بغیر کچھ لیے دینے لگے تو تمھیں کیا ضرورت پڑی ہے اپنی جیب میں نوٹ اور سکّے ڈالے پھرنے کی ہے؟

اچھا، اگر تم کسی جنگل میں کھڑے ہو، جہاں کوئی آدمی ہو نہ دکان اور تمھیں بھوک لگی ہو، اب تمھاری جیب میں چاہے کتنے بھی پیسے ہوں تم انھیں کھا تو سکتے نہیں! جب تک کھانے کی کوئی چیز نہ ہو تمھارے پیسے بالکل بے کار ہیں۔

اب چوں کہ تمھیں ضرورت کی چیزیں میرے بدلے میں ملتی ہیں اس لیے تم میری ضرورت بھی سمجھتے ہو۔ شاید اب تم مان گئے ہو گے کہ میری اپنی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اصلیت تو ان چیزوں کی ہے جن کی تمھیں ضرورت ہوتی ہے۔

اور بھائی، تمھاری دنیا میں رئیس کسے کہتے ہیں؟ — جس کے پاس بہت سے روپے پیسے ہوں! جو خوب خرچ کرتا ہو! خیر تم چاہو تو کہہ

لو اُسے رئیس، مگر میں نہیں کہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ کسی کے پاس بہت سے روپے پیسے ہوں یا نہ ہوں، اگر اس کے پاس ضرورت کا بہت سا سامان ہے تو وہ رئیس ہے، اور اگر نہیں ہے تو وہ رئیس بھی نہیں ہے!

تم نے وہ کہانی نہیں سُنی؟ ایک رئیس آدمی کسی طرح اپنے سونے چاندی، ہیرے جواہرات سے بھرے گودام میں بند ہوگیا تھا۔ کئی دن بعد جب وہ بھوک سے نڈھال ہوگیا تو بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے ایک کاغذ پر یہ لکھ کر ڈال دیا کہ "اگر کوئی شخص مجھے اس وقت ایک روٹی اور ایک گلاس پانی دے دے تو میں اُسے یہ ساری دولت دے دوں اور ساری زندگی اس کا شکریہ ادا کروں۔"

پھر یہ بات تو کسی ملک کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہاں کسی ملک میں لوگوں کے پاس چاہے کتنے بھی روپے پیسے ہوں، اگر وہاں لوگوں کی ضرورت کا سامان ہی نہیں ہے اور بازاروں میں چیزیں ہی نہیں بکتیں، تو سارا روپیہ پیسہ بیکار ہے۔ نہ لوگ روپے پیسے کو کھا سکتے ہیں، نہ ان کے کپڑے بنا کر پہن سکتے ہیں ـــ بس اصل چیزیں ہیں آٹا، سبزی کپڑا، گوشت، دال، کتابیں، قلم، ٹافیاں، مٹھائی یا وہ چیزیں جنھیں تم خریدنا چاہتے ہو۔

اب تم سوچو گے کہ جب میری کوئی اصلیت ہی نہیں تو پھر میں تمھاری دنیا میں آیا کہاں سے؟ یہ ایک دل چسپ کہانی ہے ـــ میں بہت پُرانا ہوں، میرے باپ دادا تو اور بھی پُرانے ہیں۔ خیر انسان جتنا پُرانا تو نہیں، مگر بس اس سے کچھ ہی کم پُرانا ہوں۔ چاہے میرے بزرگوں کی

شکلیں میری آج کی صورت سے بالکل بھی نہ ملتی ہوں، مگر تھے وہ میرے ہی بزرگ — سنوگے یہ کہانی؟

اچھا ضرور سناؤں گا، مگر کچھ اور باتیں اپنے متعلق تمھیں بتا دوں تاکہ تم پہلے میری آج کی حالت کو اچھی طرح سمجھ لو۔

تم یہ سن کر ذرا حیران ہوگے کہ میری اپنی بھی ایک قیمت ہوتی ہے تم کہوگے "یہ کیا بات ہوئی — ؟" ہم تو کاغذ، قلم، دوات کی قیمت پیسوں میں ناپتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ میری بھی ایک قیمت ہوتی ہے!" اچھا تم اسے یوں سمجھ لو کہ میرے بدلے میں جتنی چیزیں تمھیں ملتی ہیں بس وہی میری قیمت ہے۔ اگر تمھیں ۱۰ پیسے میں دو ٹانیاں ملیں تو میں دو ٹانیوں کی برابر — اور اگر کبھی دس پیسے میں چار ملنے لگیں تو میں چار کی برابر اور یہی میری قیمت ہوئی

تو اب تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں کہاں سے آیا اور کب آیا؟ اچھا، سنو میری کہانی — تمھیں میری نئی نئی شکلیں اور نئے نئے لباس نظر آئیں گے۔ مگر کام بس وہی ایک — یعنی میرے بدلے میں ضرورت کی چیزیں لینا یا وقت بے وقت کے لیے جمع رکھنا، تاکہ بعد میں ضرورت کی چیزیں میرے بدلے میں لی جا سکیں۔ مگر میری کہانی سے پہلے تمھیں خود اپنی یعنی انسان کی کہانی تھوڑی سی یاد کرنی پڑے گی۔

دیکھو تم آج موٹر، ریل، ہوائی جہاز اور نہ معلوم کس کس چیز پر سفر کرتے ہو۔ لیکن تمھارے دادا، یا ان سے بھی پہلے پردادا — نہ ہوائی جہاز کو جانتے تھے نہ ریل گاڑی کو — وہ تو بس بیل گاڑی پر سفر کرتے تھے۔ [illegible] دیکھیے تو ڈیڑھ سو سال میں ہی تم نے کتنی ترقی کر لی ہے

ذرا اور پہلے زمانے کی طرف چلو تو دیکھو گے کہ لوگ کچے مکانوں میں رہتے تھے۔ ذرا اور پہلے کا زمانہ ذہن میں لاؤ تو تمہیں نظر آئے گا کہ لوگ گھر بھی نہیں بناتے تھے۔ جہاں موقع ہوا سو گئے، کوئی چشمہ نظر آیا پانی پی لیا، پھل دار درخت ملا تو پھل توڑ کر کھا لیے۔۔۔ اب اس وقت ہم کئی ہزار سال پہلے کی دنیا میں ہیں۔ شاید اب سے دس، بیس ہزار سال پہلے۔۔۔

جانوروں کے بھیس میں

چلو، اس وقت سے شروع کریں جب انسان جنگلوں میں رہتے تھے۔ ہزاروں ہزار سال پہلے — اب انھیں جانوروں کا شکار کھیلنا آگیا ہے۔ پتھروں سے ہتھیار بھی بنا لیتے ہیں۔ دن بھر شکار کھیلا اور جہاں رات ہوئی وہیں سو گئے۔

تم سوچ رہے ہوگے، یہ بھی کتنا اچھا زمانہ ہوگا — بچوں کو اسکول جانے کی فکر نہ صبح اٹھ کر اسکول کا کام پورا نہ کرنے کا دھڑکا — مگر بھائی انسان تو ترقی کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ خیر چلو آگے بڑھیں — ہزار دو ہزار سال بعد انسان نے یہ بھی سمجھ لیا کہ کچھ جانور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو صرف مار کر کھا جانا ہی فائدہ نہیں پہنچاتا بلکہ ان کو زندہ رکھ کر ان سے دودھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اب لوگوں نے جانور پالنے شروع کر دیے اور یوں ہوا کہ اگر سو آدمیوں کی ٹولی ساتھ رہتی ہے تو اس کے ساتھ کچھ پالتو جانور — گائیں، بھینسیں، بھیڑیں، بکریاں بھی ہوتی ہیں۔

اور میرا کہنا تو یہی ہے کہ میرے سب سے بڑے بزرگ ایک ایسی ہی ٹولی میں پیدا ہوئے تھے۔

جنگلوں میں رہن سہن اور شکار

ایک ٹولی میں ایک شخص بدلی نام کا تھا۔ اسے پتھر کے ہتھیار بنانے میں بڑی مہارت تھی۔ وہ پتھروں کو اتنا نکیلا، اتنا دھار دار بنا دیتا تھا کہ ایک، ہی وار میں بڑے سے بڑا جانور زخمی ہو کر بھاگنے کے قابل نہ رہتا۔

کنتو بھی اسی ٹولی کا ایک جوان تھا۔ اُسے شکار میں بڑی مہارت تھی، اور شوق اتنا کہ دن دن بھر جانوروں کا شکار کرتا رہتا اور اسے ہتھیار بنانے کی بھی فرصت نہ ملتی۔

ایک دن جب کنتو کے پاس ہتھیار نہ رہے تو وہ بدلی کے پاس گیا اور اس سے دو چار ہتھیار مانگ لیے۔ مگر کچھ دن بعد اسے پھر ہتھیاروں کی ضرورت پڑی۔ وہ پھر گیا، بدلی نے پھر ہتھیار دے دیے — مگر آخر کب تک —؟ بدلی کو بھی تو شکار کھیلنا ہوتا تھا، دو ایک بار کے بعد اس نے انکار کر دیا۔

کنتو واپس تو آگیا، مگر سوچتا رہا کہ بدلی سے ہتھیار کیسے لے؟ پہلے سوچا کہ "بدلی کو مار ڈالوں اور اس سے ہتھیار چھین لوں۔" پھر خیال آیا کہ "بدلی مر گیا تو اتنے اچھے ہتھیار کون بنائے گا۔!"

بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "دیکھو بھائی بدلی! اگر تم مجھے میری ضرورت کے ہتھیار دے دو تو میں تمھیں بھیڑوں کی دس سوکھی کھالیں اور بہت سا گوشت دے دوں گا!"

بدلی نے سوچا "نقصان تو نہیں ہے — میں ہتھیار اور بنالوں گا مگر میرے پاس دس کھالیں آجائیں گی۔ اوڑھنے پہننے کے کام آئیں گی اور گھر کے لوگ کئی وقت گوشت کھائیں گے۔" وہ تیار ہو گیا، کنتو کو ہتھیار دے دیے

بدلی اور کنتو کے درمیان کھالوں اور ہتھیاروں کا لین دین
Abdul Jabbar

اور اس سے کھالیں اور گوشت لے لیا۔

بس یہیں سے ایک نئی بات انسان نے شروع کی ـــ ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز لینا ـــ کنبّوں کے پاس جو چیز زیادہ تھی اُس نے بدّلی کو دے دی اور اس سے اپنی ضرورت کی چیز لے لی۔

ایک اور نئی بات! انسان نے ضرور سوچا ہوگا کہ میں اپنی چیز کے بدلے میں دوسرے سے کتنی چیز لوں؟ پھر یہ بھی کہ دینے والا کیا میری چیز کو لے لے گا؟ کم تو نہیں سمجھے گا؟ اگر کم سمجھے گا تو انکار کر دے گا اور اپنی چیز مجھے نہیں دے گا۔

مگر اس سودے میں میرا نام تو کہیں بھی نہیں آیا! لیکن اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ کام شروع ہو گیا جس میں میری ضرورت پڑتی ہے۔ آگے چل کر میرا نام بھی آنا شروع ہو جائے گا۔

اب اگر کہیں تم یہ پوچھ بیٹھو کہ یہ پہلا لین دین کہاں اور کب ہوا؟ تو بھائی اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح سال کیا، صدی بھی نہیں بتائی جا سکتی۔ بس ہوا ہوگا یہ سودا کچھ نہیں تو دس یا پندرہ ہزار سال پہلے۔

اور کہاں کا جواب ـــ تو بھائی ایسی بات تو ہر ملک میں ہی ہوئی ہوگی۔ جہاں بھی انسان تھا وہاں ایسا لین دین ضرور ہوا ہوگا، کہیں دو چار سو سال پہلے، کہیں دو چار سو سال بعد ـــ

اچھا چلو، کچھ اور آگے بڑھیں ـــ اب وہ زمانہ ہے کہ لوگوں نے ایک جگہ رہنا شروع کر دیا ہے۔ دو سو ڈھائی سو خاندان ایک ہی جگہ رہتے ہیں معمولی جھونپڑیاں ہیں۔ لکڑی یا مٹی کی کچی دیواروں پر چھپّر جیسی چیزیں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ گھروں کی چاروں طرف کی زمین پر لوگوں نے تھوڑا بہت

بونا بھی شروع کر دیا ہے۔ مگر گاؤں کے سارے ہی لوگ کھیتی نہیں کرتے کچھ لوگ اب بھی شکار کھیلتے ہیں، رات کو گھر آجاتے ہیں، گوشت کھا لیتے ہیں اور کھالیں سکھا لیتے ہیں۔ کچھ اب بھی جانور پالتے ہیں، دودھ پیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اور بھی چھوٹے موٹے کام شروع کر دیے ہیں۔ کوئی ہل بناتا ہے کوئی ہتھیار۔

مگر ان کے سامنے ایک مشکل بہت سخت ہے ـــ کھیتی کرنے والا جتنا اناج اگاتا ہے وہ اس کے خاندان کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ دوسری طرف شکاری جتنا گوشت گھر لاتا ہے، وہ بھی اس کے گھر والوں کی ضرورت سے زیادہ ہے اور وہ بہت جلدی سڑنے بھی لگتا ہے۔ ایک طرف گائے بھینس پالنے والا پریشان ہے کہ گھر والے کافی دودھ پیتے ہیں مگر پھر بھی بہت سا دودھ بچ کر بے کار ہو جاتا ہے۔

تم کہوگے کہ یہ لوگ بھی کنٹو اور بدلی کی طرح آپس میں چیزیں کیوں نہیں بدل لیتے ـــ؟

خیر بھائی، چیزوں سے چیزیں بدل کر کام تو چل جاتا تھا مگر کبھی کبھی مشکل بھی بہت پیش آتی تھی۔

ایک آدمی کے پاس گوشت تھا۔ اسے اناج کی ضرورت تھی۔ لیکن اناج والے کو گوشت کی ضرورت نہ تھی، مٹی کے برتن چاہیے تھے۔ اب کیا ہو ـــ؟

ایک غریب دو سوکھی کھالیں لیے پھرتا تھا۔ اُسے اناج لینا تھا، ہتھیار لینے تھے اور رات کو جلانے کے لیے کچھ چربی بھی چاہیے تھی۔ وہ بے چارہ پریشان تھا کہ اتنا سامان لینے کے لیے دو کھالوں کو کیسے بانٹوں، سارا سامان

ایک دکان پر تو تھا نہیں کہ جائے، کھالیں دے اور سامان لے لے

بس اب انسان نے سوچنا شروع کیا کہ دو چیزوں کے بیچ میں ایک اور تیسری چیز ڈال کر لین دین کو آسان کیا جا سکتا ہے۔

مگر کیا یہ بات تمھیں عجیب نہیں لگی کہ دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں تیسری چیز ڈال کر سودا آسان کیسے ہو جاتا ہے؟ ٹھہرو! میں تمھیں مثال دوں تو تم ابھی سمجھ جاؤ گے۔

فرض کرو تمھیں ایک کتاب خریدنی ہے۔ کتاب بیچنے والے کو آٹا خریدنا ہے۔ تم نے اپنے ابا امی سے پیسے لیے، کتابوں کی دکان پر گئے، پیسے دیے اور کتاب لے آئے۔ اُدھر دکان دار ان پیسوں سے آٹا لے آیا۔ آٹے والے کو بھی کپڑا خریدنا تھا، وہ کپڑے والے کی دکان پر گیا۔ پیسے دیے اور کپڑا لے آیا۔

دیکھا — ! دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں پیسے ڈال دیے اور سودا آسان ہو گیا — مگر تم خوش نصیب ہو کہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب یہ سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ مگر جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت نہ پیسہ تھا نہ روپیہ — بس سامان تھا۔

اب لوگوں نے سوچا کہ دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں کوئی ایسی چیز ڈال دیں جس کی سب کو ضرورت ہو، یا کم از کم اس کی قدر تو سب ہی کرتے ہوں — بتا سکتے ہو کہ اس زمانے میں، وہ کیا چیز ہوگی — ؟ پالتو جانور — ! اس لیے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے جانور پہلے پالنے شروع کیے، کھیتی باڑی بعد میں۔

جانور تو سب ہی پالتے تھے۔ دس بیس بھیڑ بکریاں، گائے بھینس

بازار میں جانوروں کے ذریعہ لین دین

سب رکھتے تھے۔ اب ان کے بدلے میں چیزیں بھی آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اب کچھ یوں ہوتا کہ کھالوں والا چند بھیڑوں سے کھالیں بدل لیتا اور جب چاہتا اپنی ضرورت کا سامان ان کے بدلے میں لے آتا۔

تو بھائی یہ تو بڑی آسانی ہوگئی ـــــ! اب اسے بہت زیادہ بھاگ دوڑ بھی نہیں کرنی پڑتی تھی ـــــ اس کے گھر میں بھیڑ بکریاں تھیں وہ جب چاہتا سامان ان کے بدلے میں لے آتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ کبھی اور لوگ بھی اس کے پاس آتے ـــ بھیڑ بکریاں دیتے اور اپنی ضرورت کے مطابق کھالیں اس سے لے جاتے۔

اب تم اسے یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ جو کام آج روپے پیسے سے لیا جاتا ہے اس وقت وہی کام جانوروں سے لیا جانے لگا۔ گائے، بیل بھینس وغیرہ بڑے جانور ہیں ـــ ظاہر ہے ان کے بدلے میں زیادہ سامان ملتا ہوگا۔ بھیڑیں، بکریاں چھوٹے جانور ہیں اس لیے ان کے بدلے میں تھوڑا سامان ملتا ہوگا ـــ خیر، جانوروں کے بدلے میں سامان لیا دیا جانے لگا اور ایک نیا چکر چل پڑا۔

خود تمھارے ہی ملک میں گائے کو اور چھوٹے لین دین میں بکری کو، پرانے زمانے میں بہت دن تک استعمال کیا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ جب کسی کو زیور بنوانے کے لیے سونا یا چاندی خریدنی ہوتی تو وہ گائے سے بدل لیتا تھا۔

لو بھائی! یہ رہا میں ـــ! نظر آیا ـــ! خیر نظر تو نہیں آیا، بلکہ میرا نام بھی نہیں آیا لیکن پھر بھی میرا کام ضرور شروع ہوگیا ـــ اور میں تو ہمیشہ ہی روپ بدلتا رہا ہوں۔ مگر کام بس ایک ہی رہا۔

اور اس پر اگر تم مجھے چڑھانا ہی چاہتے ہو تو میں یہ بھی مان لوں گا کہ میرے دادا پردادا یا سب سے بڑے بزرگ جانور تھے ــــــ! مجھے کیا ــ میں تو تمھیں اپنی کہانی سُنا رہا ہوں اور میں یہ بھی خوب سمجھتا ہوں کہ تم مجھے کبھی ناراض نہیں کرنا چاہو گے ــ!

اناج کے بھیس میں

چلو اب اور آگے بڑھیں — انسان نے ترقی کی اور اب ہر جگہ باقاعدہ کھیتی باڑی ہونے لگی۔ گاؤں کے زیادہ لوگ اسی میں لگے رہتے ضرورت کا دوسرا سامان انھیں گاؤں میں مل ہی جاتا تھا۔ اب لوگوں نے ایک جگہ جم کر رہنا شروع کر دیا۔ جب ان کی بوئی ہوئی فصلیں کھڑی ہوں تو وہ اپنی جگہ چھوڑ کر کیوں جائیں؟ گاؤں بڑے ہو کر قصبے بننے لگے ضرورت کا سامان بھی اب گھروں میں بند نہ رہتا تھا — ہفتے میں ایک یا دو دن بڑے بڑے گاؤں یا قصبوں کی پینٹھ — یعنی بازار — میں آجاتا تھا۔ لوگ قریب کے چھوٹے چھوٹے گاؤوں سے آکر اپنی ضرورت کا سارا سامان خرید لیتے تھے — اپنے ساتھ اپنے جانور لائے اور ان کے بدلے میں چیزیں خرید لیں۔

بس، بہت دنوں تک تو یہ جانور ہی آدمی کی دولت رہے۔ نقد اُدھار سب کچھ ان گائے، بھیڑ، بکریوں سے چلتا رہا، مگر بعد میں اس میں بھی کچھ پریشانیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں۔

ایک گاؤں میں بھلو نام کے ایک آدمی کا گھر بارش میں گر گیا۔ دیواریں تو اس نے کچی مٹی سے پھر بنا لیں لیکن چھپر اور دروازوں وغیرہ کے لیے

اور کچھ مزدوروں کو دینے کے لیے اس کے پاس اس زمانے کی دولت — بھیڑ بکریاں — نہ تھی۔ چناں چہ بہلو اپنے دوست نتھی کے پاس گیا اور اس سے سو بھیڑیں اُدھار لے لیں۔ اس سال بارش کی وجہ سے خوب ہریالی تھی، بھیڑیں خوب موٹی ہو رہی تھیں۔

کچھ سال بعد جب بہلو نے نتھی کو ادھار چکایا تو اس سال بارش نہیں ہوئی تھی — جانور بھوک سے سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔ مگر بہلو نے تو گن کر سو بھیڑیں لی تھیں۔ انھیں لیتے وقت تولا تو نہیں تھا — وہ ویسی ہی سوکھی، اَدھ مری بھیڑیں لے گیا۔ دونوں میں خوب جھگڑا ہوا — قرضہ چکانے والا کہتا — "میں نے تو سو بھیڑیں لی تھیں، میں پوری سو واپس کر رہا ہوں —" مگر نتھی غریب کا تو بڑا نقصان ہوا۔

پھر ذرا یوں بھی سوچو — فرض کرو کہ ایک بھیڑ کے بدلے میں دو من گیہوں ملتے ہیں۔ مگر ایک آدمی صرف ایک من ہی خریدنا چاہتا ہے۔ اب کیا ہو —؟ بھیڑ کو آدھا آدھا تو نہیں بانٹا جا سکتا! — سوچو آج کی دنیا میں تمھیں کتنی آسانی ہے، ہزار روپے کے نوٹ سے لے کر پیسے کے سکوں تک سب کچھ موجود ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا سامان خرید لو۔!

ویسے بھی اگر کسی وبا میں جانور مر جاتے تھے تو جتنے امیر تھے وہ غریب ہو جاتے۔ پھر جیسے جیسے دولت — بھیڑ بکریاں بڑھتی، اسے رکھنے کے لیے بڑے بڑے باڑوں کی ضرورت پڑتی ہوگی چراگاہوں کی ضرورت ہوتی ہوگی اور پھر جب بازار سے بہت سامان لانا ہوتا ہوگا تو پہلے بہت سے جانور ہانک کر بازار لے جانے پڑتے ہوں گے۔ کھلے جنگلوں سے لوگ اس دولت کو ہانک کرلے جاتے ہوں گے۔

بس اب انسان نے سوچا ہو گا کہ کوئی اور ایسی چیز کام میں لاؤ جو تھوڑی جگہ گھیرے، بیماری سے مر نہ جائے، ٹکڑوں میں بانٹی جا سکے اور پھر سب کے استعمال کی چیز بھی ہو — جبھی تو لوگ اس کی قدر بھی کریں گے۔

کیا چیز اب سب سے زیادہ استعمال ہوتی تھی — ؟ — اناج! ہاں بھائی، روٹی تو ہر شخص کھاتا ہی تھا۔

لوگوں نے اب آہستہ آہستہ جانوروں کی جگہ اناج کو لین دین میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اب تو بہت آسانی تھی — چھوٹے سے چھوٹا سامان خرید لیجیے۔ اگر بہت سا اناج بازار لے جانا ہے تو گھر کی بیل گاڑی میں منوں اناج بھر لیا، بہت سے جانور ہانکتے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے — گاڑی میں دولت بھی بھری ہے، گھر کے دو ایک آدمی بھی بیٹھے ہیں اور واپسی میں خریدا ہوا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔

اناج کو 'دولت' کی جگہ شاید سب سے زیادہ دن استعمال کیا گیا بعض بعض جگہ تو آج بھی استعمال کیا جاتا ہے — کہیں کہیں بہت چھوٹے گاؤوں میں لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں اناج سے بدل لیتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی اتنی پرانی بات ہے کہ اس کی بھی صحیح صحیح تاریخ بتانی مشکل ہے۔ الگ الگ ملکوں میں یہ حالت الگ الگ زمانوں میں رہی۔ ہر ملک کے لوگ ترقی کرتے گئے اور یہ باتیں خود بخود سیکھتے چلے گئے خیر یوں سمجھ لو کہ کسی ملک میں یہ بات آج سے دس بارہ ہزار سال پہلے تو کسی میں آٹھ دس ہزار سال پہلے شروع ہوئی ہوگی۔

اچھا، تو تمہیں میرے ایک اور بزرگ 'اناج صاحب' بھی نظر آ گئے۔

سونا، چاندی، تانبا

اچھا چلو اور آگے بڑھیں — اب ہم ایک نئے زمانے میں آ گئے ہیں۔ اب انسان نے بہت ترقی کر لی ہے، اس کے کام بدل گئے ہیں کام کرنے کے اوزار بدل گئے ہیں، رہن سہن بدل گیا ہے — جانتے ہو یہ سب کیسے ہو گیا؟ صرف ایک نئی چیز کو معلوم کر لینے سے — دھات — جی ہاں! یہی تانبا، پیتل، سونا، چاندی، لوہا وغیرہ۔

انسان نے دھات ایجاد نہیں کی۔ یہ تو زمین سے کھود کر نکالی جاتی ہے۔ بس پہلے انسان اس کو استعمال کرنے کا طریقہ نہیں جانتا تھا۔ اب اس نے پہلے دھات کو کوٹ کوٹ کر اور بعد میں پگھلا کر اس سے اپنی ضرورت کا سامان بنانا سیکھ لیا۔

اس سے کتنا فائدہ ہوا، کیا تم اندازہ کر سکتے ہو؟ تم نے تو دھات کو پہلے سے استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ اگر کوئی پہلی پہل تمھیں اس کا استعمال بتاتا تب تمھیں اندازہ ہوتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ دھات نے انسان کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی — اوزاروں، ہتھیاروں میں پتھر کی جگہ دھات کے پھل لگنے لگے۔ گھر میں مٹی کے برتنوں کی جگہ دھات کے برتن آنے لگے — اور سچ پوچھو تو انسان نے ترقی بھی بہت کی اس

کے بعد۔ اب اسے تیز اوزار مل گئے تھے نا ۔۔! سوچو ! چمڑا سینے کی کٹرنی ، اور چاہے موٹی ہی سہی مگر اب سوئی بھی بن سکتی تھی ۔۔ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ۔

اب ممکن ہے تم سوال کرنے لگو کہ دھات سب سے پہلے کہاں اور کب ملی ، اور کون سی دھات سب سے پہلے انسان کو ملی ؟ ۔۔ تو بھائی ، دنیا کی جتنی بھی پرانی بستیوں کا لوگوں کو پتہ مل سکا ہے وہاں اور سامان کے ساتھ دھات کا سامان بھی ضرور ملا ہے۔

افریقہ کے ایک ملک مصر کا نام تو تم نے سنا ہو گا ، مصر کے رہن سہن کو دنیا کی کچھ سب سے پرانی تہذیبوں میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ دریائے نیل کی وادی بہت زرخیز تھی اور ایک بہت بڑے علاقے میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی کوئی چار ہزار سال پہلے یہاں بڑے بڑے بادشاہوں کی حکومت تھی۔ اب مصر میں زمین کو کھود کھود کر اس زمانے کے کچھ شہروں کے نشان نکالے گئے ہیں۔ بادشاہوں کی کچھ قبریں بھی ملی ہیں جنھیں 'اہرامِ مصر' کہتے ہیں۔ ان میں کچھ مسالے لگا کر بادشاہوں کی لاشوں کو اس طرح رکھ دیا گیا تھا کہ وہ آج تک بھی خراب نہیں ہوئیں۔ ان قبروں میں سے جو سامان ملا ہے اس میں دھات کے برتن ، زیور ، ہتھیار اور نہ معلوم کیا کیا کچھ موجود ہے۔

پھر مصر کے ساتھ ہی اور بھی کئی ملکوں کے نام آتے ہیں ۔۔۔ عراق میں دجلہ اور فرات دریاؤں کے بیچ میں بابل اور اسیریا نام کی آبادیاں تھیں۔ اسی طرح روم ، اٹلی ، چین اور یونان میں بھی تقریباً اتنے ہی پرانے شہروں کے نشان ملے ہیں۔ یہاں رکھی ہوئی چیزوں

سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ بھی دھاتوں کو استعمال کرتے تھے۔

خود ہمارے ملک میں بھی کئی ایسے شہر ملے ہیں۔ پنجاب اور سندھ کے اس علاقے میں جو اب پاکستان میں شامل ہے — موہنجوڈارو اور ہڑپا کے شہر۔ ان کے علاوہ بھی ہندوستان میں بہت سی جگہوں پر اتنی ہی پرانی آبادیوں کے نشان مل رہے ہیں، جن کے متعلق معلومات حاصل کی جارہی ہے۔ ان ساری آبادیوں کے متعلق تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ یہ تمام بستیاں حضرت عیسیٰ سے کوئی ڈھائی تین ہزار سال پہلے آباد تھیں۔ ان میں بھی دھات کے بنے برتن اور اوزار ہتھیار ملے ہیں۔

اب اِن سے تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو کہ دھات کا استعمال انسان نے کب شروع کیا ہو گا۔

اور کون سی دھات کا جواب یہ ہے کہ شاید تانبا وہ دھات ہے جسے انسان نے سب سے پہلے استعمال کرنا شروع کیا۔ ویسے جب ایک دھات کا فائدہ انسان کو معلوم ہو گیا ہو گا تو دوسری دھاتوں کے استعمال میں بھی زیادہ دیر نہ لگی ہو گی — ہاں یہ بات ضرور کچھ حیرت کی ہے کہ وہ دھات جو آج سب سے زیادہ انسان کے کام آتی ہے — یعنی لوہا۔ وہ بہت بعد میں انسان نے استعمال کرنی شروع کی۔

تم کہو گے کہ میں اپنی کہانی چھوڑ کر دھاتوں اور پتھروں کی کہانی سنانے بیٹھ گیا — نہیں، ایسی بات نہیں ہے، اصل میں دھات کا اثر انسان کی زندگی پر کچھ اتنا گہرا پڑا کہ وہ چیزیں جو اس کے ساتھ رہتی تھیں وہ تک بدل گئیں۔

اس دھات نے تو خود میری بھی صورت بدل کر رکھ دی اور میری

وہ صورت آج تک ویسی ہی چلی آرہی ہے۔ اب اگر میں اس کا حال بیان نہ کروں تو کس کا حال بیان کروں؟

اچھا بھئی! اپنی کہانی سُنانے سے پہلے میں دو دھاتوں کے بارے میں تمھیں کچھ اور بتاتا چلوں۔ اصل میں یہی دو دھاتیں میری زندگی میں سب سے زیادہ کام آئی ہیں اور تم بھی انہی کو سب سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہو لیکن بھائی، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم انسان لوگ آخر سونے کو سب سے قیمتی کیوں سمجھتے ہو؟ سونے کا استعمال یا سونے کا فائدہ اور دھاتوں کے مقابلے میں انسان کو سب سے کم ہوتا ہے — اور لوہا تمھارے کتنے کام آتا ہے — ریل گاڑیاں، موٹریں، مشینیں سب کچھ تو لوہے سے بنتی ہیں۔ باورچی خانے میں چمٹا، توا لوہے کا ہوتا ہے — تانبے کو لو۔ گھر کی پتیلیاں تک تو تانبے کی ہیں

مگر تمھارا یہ عجیب انداز ہے کہ لوہا تو کوڑیوں کے مول بکے اور سونا — ! جو مشین بنانے کے کام آئے نہ برتن بنانے کے، نہ اس کی کیل بن سکے نہ ریل کی پٹڑی — مگر تم اسے ہی سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہو۔

خیر — انسان کی باتیں تو انسان جانے، مگر میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ سونے میں کچھ ایسی باتیں ضرور ہیں جو کسی اور دھات میں نہیں ہیں۔ بس شاید اسی لیے یہ انسانوں کو اتنا بھا گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سونا بہت چمک دار ہوتا ہے، دیکھتے ہی دل کو بھاتا ہے۔ اس سے بھی اچھی بات یہ کہ گھِستا بہت کم ہے۔ برسوں اس کا زیور پہنیے۔ کیا مجال جو رنگ یا وزن میں ذرا فرق آجائے۔ اس کے مقابلے میں ہر دھات بہت جلدی گھِس جاتی ہے۔

ایک طرف تو سونے میں یہ سختی کہ گھسنا جانتا ہی نہیں اور دوسری طرف وہ نرمی اور وہ لچک کہ دھات تو دھات شاید دنیا کی کسی چیز میں بھی نہ ہو — جتنا باریک تار چاہے بنا لیجیے۔ پھر باریک ہونے میں تو شاید اس کا جواب ہی نہ مل سکے — سونے کے ورق کی باریکی کی حد یہ ہے کہ اگر باریک باریک ایک لاکھ پچاس ہزار ورقوں کو اوپر نیچے رکھ لو تو بس ایک انچ موٹائی میں آجائیں گے۔

ایک اور عجیب بات — ! اس پر موسم کی گرمی، سردی، خشکی، تری کچھ اثر ہی نہیں کرتی۔ حد یہ ہے کہ کوئی تیزاب اسے گلا نہیں سکتا۔ ذرا لوہے یا تانبے کو تو ایک سال پانی میں ڈالے رکھو، زنگ بن کر گھل جائے گا مگر سونا اگر صدیوں بھی زمین میں دبا رہے، ذرا خراب نہیں ہوتا — اور پھر سب سے آخر میں یہ بات کہ اتنی آسانی سے نہیں ملتا جیسے اور دھاتیں مل جاتی ہیں۔ اور تمھیں تو بس وہی چیز پسند آتی ہے جو کم ہو۔

ویسے تو چاندی میں بھی یہ ساری باتیں موجود ہیں مگر صرف دو باتوں میں یہ سونے سے ذرا کم ہے۔ ایک تو چاندی تیزاب میں گھل جاتی ہے اور دوسرے وہ سونے سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ شاید اسی لیے سونا چاندی سے بازی لے گیا ہے۔

مگر بعض جگہ چاندی کو سونے سے قیمتی بھی سمجھا گیا ہے۔ بعض جگہ تو لوگ سنہرے رنگ کو ہی بُرا مانتے تھے اور بعض جگہ چاندی کی کانیں ہی نہیں تھیں۔ ایسی جگہوں پر سونا سستا اور چاندی مہنگی بکتی تھی جیسے مصر کی بہت پرانی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عرصے تک وہاں چاندی مہنگی اور سونا سستا رہا ہے۔

اچھا بھائی! تو میں نے خاص طور پر تمھیں ان دھاتوں کے بارے میں بتلا دیا جن کا مجھ سے بہت زیادہ گہرا تعلق رہا ہے۔ سونا اور چاندی بھی انسان کے ساتھ تقریباً اسی وقت سے ہیں جب سے تانبا ہے۔ بلکہ کچھ تاریخ دانوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ سونا شاید سب سے پہلی دھات تھی جو انسان نے پسند کی۔ خیر کچھ بھی ہو، مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ مصر، یونان اٹلی، چین، ہندستان، عراق، ایران، غرض جہاں جہاں کے حالات بھی پتہ چل سکے ہیں وہاں سونا اور چاندی بھی نظر آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کا استعمال کہیں سو دو سو سال پہلے شروع ہوا ہو، کہیں سو دو سو سال بعد۔

اچھا بھائی تو میری کہانی کہاں پہنچی تھی؟

شاید لوگوں نے اناج کو بھی دولت کی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اپنی دھات والی شکل تمھیں دکھلاؤں یہ اور بتا دوں کہ میں نے جانوروں، اناج اور دھات کے علاوہ بھی بہت سی شکلیں بدلی ہیں۔

ایک سمندری جانور — 'کوڑی' کو تو تم نے دیکھا ہوگا۔ یہ بحرِ ہند کے اُتھلے پانی میں ملتی ہے۔ پانی سے نکال لیتے ہیں تو اس کے اندر کا جانور مر کر سوکھ جاتا ہے اور جھڑ جاتا ہے اور خوب صورت خول باقی رہ جاتا ہے۔

خود ہندستان میں ہی اب سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے ایک پیسے میں چونسٹھ کوڑیاں بھنائی جا سکتی تھیں۔ یہ کوڑی بھی انسان کو کچھ ایسی بھائی کہ لین دین میں شاید اسے ہر ملک میں استعمال کیا گیا۔ حد

یہ ہے کہ افریقہ کے کچھ علاقوں میں تو لوگ آج بھی اسے استعمال کرتے ہیں.

لوگوں نے کوڑی کو میری جگہ کیوں استعمال کرنا شروع کیا ـــــ؟ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی. کوڑی انسان کی عام زندگی میں تو کوئی بہت زیادہ کام آتی نہیں۔ اور شروع میں انسان نے عام طور پر اُسی چیز کو سکّے کی جگہ استعمال کیا ہے جو اس کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہو تم سُن ہی چکے ہو کہ پہلے جانوروں کو لین دین میں کام میں لایا گیا اور پھر اناج کو ـــ اور ان دونوں چیزوں کی انسان کو ہمیشہ بہت ضرورت رہتی تھی.

لیکن اس کوڑی کی مقبولیت کی حد تو یہ تھی کہ گجرات صوبے میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی پانچ سو سال بعد بھی تانبے کے ایک سکّے کا نام ہی "کوڑی" رکھ دیا گیا تھا.

کوڑی کے علاوہ میں کبھی ہاتھی دانت اور سیپ کے روپ میں بھی نظر آیا ہوں. اور پھر میرے کچھ روپ تو ایسے بھی رہے ہوں گے جن کا ابھی تک پتہ ہی نہیں چل سکا ہے. جب تم لوگ اور ترقی کرو گے اور تمہارے پاس اور بہت سی معلومات جمع ہو جائے گی تو ہو سکتا ہے میرے کچھ اور بزرگوں کا بھی پتہ چل جائے.

ہاں ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنا. ایسا نہیں تھا کہ اناج کو میری جگہ استعمال کرتے کرتے انسان نے اسے ایک دم ہی چھوڑ دیا اور کوڑی، سیپ یا ہاتھی دانت کو استعمال کرنا شروع کر دیا. یہ تو کچھ اس طرح ہوا کہ الگ الگ جگہوں پر انسان نے جس چیز میں بھی آسانی دیکھی بس اسی کو دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں ڈالنا شروع کر دیا. بعض بعض جگہ تو ایک ہی وقت

میں دو دو یا تین تین یا کبھی کبھی تو اس سے بھی زیادہ چیزیں کام میں آتی رہیں۔

اور اب ایک مزے دار سکّے کا حال بھی سُن لو — ! تیرھویں صدی عیسوی میں ایک سیّاح، مارکوپولو نے لگ بھگ آدھی دنیا کا چکّر لگایا تھا۔ اس نے سب سے اچھا کام یہ کیا کہ اپنا ایک سفرنامہ بھی لکھا۔ بڑا دلچسپ حال ہے یہ — اِسی میں اُس نے اس مزے دار سکّے کا حال بھی لکھا ہے۔

تبّت کے مغرب میں اس نے ایک صوبے 'گیعڈو' کے حال میں لکھا ہے کہ وہاں نمک کے سکّے چلتے تھے — جی ہاں اسی نمک کے، جس کے بغیر تمھارا کوئی کھانا مزے دار نہیں ہوتا! اس نے لکھا ہے کہ بہت سے نمک کو گھول کر سانچوں میں ڈال کر اس کی ٹکیاں بنا لیتے تھے پھر انھیں سینک کر سکھا لیتے تھے اور ان پر چین کے بہت بڑے بادشاہ قبلائی خان کی مہر لگاتے تھے۔ جب سکّہ ٹوٹ جاتا تو اسے کھانے پکنے کے کام میں لے آتے تھے ورنہ وہ سکّہ کی طرح چلتا تھا۔

ایسا ہی ایک سیّاح ابنِ بطوطہ بھی تھا۔ اس نے بھی مارکوپولو سے کوئی پچاس سال بعد تقریباً آدھی دنیا کا چکّر لگا ڈالا تھا۔ اس نے افریقہ کے سوڈان ملک کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں بھی نمک کا سکّہ چلتا تھا۔ یہاں لوگوں کے پاس سونا تھا ضرور، مگر لوگ اسے اتنا قیمتی نہ مانتے تھے۔

اب ہو سکتا ہے کہ نمک کے سکّے کو سن کر تم سوچنے لگو کہ اگر کہیں تمھاری حکومت ہو جائے تو تم ٹافی یا بسکٹ کے سکّے چلوانے لگو۔

پھر ہو سکتا ہے کہ میرے کچھ روپے اور ایسے رہے ہوں جن کا پتہ

ابھی خود مجھے بھی نہ ہو — تم بھی خوب پڑھ لکھ کر کوشش کرنا کہ میرے کچھ کھوئے ہوئے بزرگوں کی شکلیں ڈھونڈھ نکالو۔

اچھا خیر، ایک بار پھر وہیں سے چلیں — انسان نے دھات کا استعمال سیکھ لیا ہے۔ دھات کی چیزوں کو استعمال کرتے کرتے بہت جلدی انسان دھات کے استعمال کا اتنا عادی ہو گیا ہو گا کہ اس کے بغیر کام ہی نہ چلتا ہو گا — جیسے تم آج عادی ہو۔

اب ہر دھات کے استعمال کے بعد اس کی کمی یا زیادتی کے ساتھ اس کی ایک خاص قدر اس کے دماغ میں جم گئی ہو گی جیسے وہ دس سیر اناج کے بدلے میں ایک سیر تانبا لے لیتا ہو گا، یا ایک چھٹانک چاندی — یا پانچ من اناج کے بدلے میں ایک تولہ سونا۔ اس طرح اس کے دماغ میں ہر دھات کی الگ الگ ایک قیمت بن گئی ہو گی ورنہ وہ کیسے دھات کو اپنی چیز کے بدلے میں لے لیتا — ؟

اور پھر آج والی شکل پر آنے کے لیے بھی میں نے جو جو روپ دھارے ہیں وہ ایک الگ کہانی ہے۔ اب اگر وہ پُرانے روپ میں تمہیں نہ دکھاؤں تو ممکن ہے تم سمجھ بیٹھو کہ بس جس دن دھات مل اُسے خوب صورت سا کاٹ کر، اس پر مہریں لگا کر اس کا نام "سکّہ" رکھ دیا گیا — اور بس ختم ہوئی میری کہانی — !

انسان نے مجھ پر بہت دن بعد اعتبار کیا ہے۔ اصل میں یہ دولت کا معاملہ تھا اور انسان کو ڈر تھا کہ میں اُسے دھوکا نہ دے جاؤں۔

شاید انسان نے دھات سے سب سے پہلے ہتھیار اور کھیتی باڑی کے لیے اوزار بنائے ہوں گے — کُھرپا، پھاوڑا، کلہاڑی، چاقو وغیرہ —

پھر اس کے بعد شاید برتن بنے ہوں گے۔

انسان نے کیا یہ کہ اناج کی بجائے ان کھرپوں، پھاوڑوں کو دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں ڈال دیا۔ اب یوں ہوتا ہوگا کہ جب کوئی بازار چلا تو کندھے پر دو پھاوڑے، تھیلے میں کچھ چاقو، کھرپے ساتھ لیتا چلا گیا۔ جس قیمت کی چیز خریدی ویسا ہی اوزار دے دیا۔ دکان دار نے اس لیے اسے لے لیا کہ کل کوئی دوسرا گاہک آئے گا، کچھ اور سامان دے کر کھرپے، پھاوڑے، چاقو وغیرہ لے جائے گا۔ اسی طرح بعد میں گھریلو استعمال کے برتن — تانبے کے کلسے کٹورے — بھی کچھ دن کام میں لائے گئے — بالکل ویسے ہی جیسے آج تم روپے پیسے استعمال کرتے ہو۔

اب تم کہو گے کہ اس کا پتہ کیسے چلا —؟ چوں کہ کچھ نہیں کچھ نہیں تو یہ چھ سات ہزار برس پہلے کی باتیں تو ہوں گی ہی — کہیں میں گپ تو نہیں ہانکنے لگا! نہیں بھائی ایسا نہیں ہے۔ خیر اس میں تو شک نہیں ہے کہ میرے متعلق بہت سی باتیں صرف اندازہ لگا کر ہی کہی گئی ہیں مگر یہ اندازے بھی کچھ پکی باتوں پر ہی لگائے گئے ہیں۔

کچھ ایسا لگتا ہے کہ شروع میں تو بالکل اصلی اوزار ہتھیار ہی لین دین میں کام آئے ہوں گے۔ مگر پھر بعد میں ان کی شکل تو باقی رہ گئی مگر اصلیت جاتی رہی۔ کھرپے چاندی کے ہو گئے اور بہت چھوٹے — جو کسی طرح بھی گھاس کھودنے کے کام نہیں آسکتے تھے۔

بہت سے چھوٹے چھوٹے پھاوڑے، کدال، بسولے وغیرہ بعض جگہ ہزاروں سال پرانی آبادی کے نشانوں میں اس طرح رکھے ہوئے ملے ہیں جیسے آج ہم تجوریوں میں نوٹ اور پیسے رکھتے ہیں — اور پھر جب اصلی سکے

بھی شروع ہو گئے تب تک انسان کے دماغ پر یہ اوزار ہتھیار اتنے جمے ہوئے تھے کہ وہ اپنے دھات کے ٹکڑوں پر بھی ان کی تصویریں کھود دیتا تھا۔

اب بتاؤ کہ اگر کچھ ایسے پُرانے سکے ملیں جن پر پھاوڑوں، کھرپوں اور دوسرے اوزار ہتھیاروں کے نشان بنے ہوں۔ پھر اس سے پہلے کی آبادیوں میں چاندی، سونے اور تانبے کے چھوٹے چھوٹے اوزار ایسے رکھے ہوئے ملیں جیسے روپیہ جمع کر کے رکھا جاتا ہے ــــ اور پھر اس سے بھی پرانی آبادیوں میں بہت سے بالکل اصلی کھرپے پھاوڑے وغیرہ اس طرح رکھے ہوئے ملیں جس سے اندازہ ہو کہ کم ازکم اس جگہ وہ کھیتی باڑی کے کام نہ آرہے ہوں گے تو کیا یہ اندازہ لگانا بہت غلط ہوگا کہ انسان نے پہلے ان اصلی اوزاروں ہتھیاروں کو ہی دولت کی طرح استعمال کیا ہوگا ؟

کہو! اب تم کیا کہتے ہو؟ اور بھائی اگر اب بھی تم میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو بڑے ہو کر نئی نئی معلومات حاصل کر کے کوئی اور اس سے اچھی اور صحیح بات بتا دینا۔

اب اگر تم یہ پوچھو، کہ ، صاحب انسان کو اناج کے استعمال میں ہی آخر ایسی کون سی پریشانی تھی تو میں یہی کہوں گا کہ انسان ہمیشہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں ڈھونڈھتا رہا ہے ــــ کیا ایک من اناج کے بدلے میں دس سیر کے اوزار ہتھیار لے جانا آسان نہیں ہے ــــ ؟

اور پھر اناج کا ہی کیا اعتبار ــــ ؟ بارش ہوئی تو اس سال اناج بہت ، نہیں ہوئی تو بہت کم ــــ پھر آج کی طرح بڑے بڑے گودام کہاں تھے ؟ لوگوں کی دولت چڑیاں اور چوہے کھا جاتے ہوں گے اور

بھائی انسان نے تو ہمیشہ یہی چاہا کہ دولت اگر بڑھے نہیں تو کم سے کم گھٹے تو نہیں۔!

لوگ اوزاروں اور برتنوں کو بہت دن تک لین دین کے درمیان استعمال کرتے رہے۔ مگر پھر انھوں نے سوچا کہ جب دھات ہی استعمال میں لانی ٹھہری تو چاندی کو کوٹ پیس کر چھوٹا سا کھرپا ہی کیوں بنایا جائے —؟ ایک تُلا ہوا ٹکڑا بھی تو اسی کام آسکتا ہے!

چناں چہ لوگوں نے دھاتوں کی لمبی لمبی پٹیاں بنالیں — اب جب بازار چلے تو تھیلے میں ایک آدھ سونے کی، دو ایک چاندی کی اور پانچ سات تانبے کی پٹیاں ڈال لیں۔ جہاں کچھ سامان لیا کسی پٹی میں سے ضرورت کے مطابق ٹکڑا کاٹا اور دے دیا۔ جب کوئی بڑا بیوپاری کہیں چلتا تو اس کے سامان میں جہاں ضرورت کی اور بہت سی چیزیں ہوتیں وہاں سونے چاندی، تانبے وغیرہ کی بہت سی پٹیاں بھی ہوتیں۔

دیکھا! اب تمھیں میری کچھ کچھ ایسی شکل نظر آنے لگی جو میری آج کی صورت سے بہت قریب ہے۔ اور رہا نام — تو نام تو ہر زمانے اور ہر ملک میں بدلتا رہا ہے۔

خیر کام تو چلتا رہا، مگر وہ دھات کی پٹیاں کتنے دن چلتیں —؟ جلدی ہی ان کے ٹکڑے رہ جاتے ہوں گے! اور پھر پٹیوں اور ٹکڑوں میں فرق ہی کیا —؟

اگر دھات وہی ہے تو چاہے وہ پٹی ہو، یا گول، چوکور ٹکڑا ہو، سب ایک ہیں۔ پھر جب کچھ دن بعد ٹکڑے آسانی سے چلنے لگے ہوں گے تو بیوپاریوں نے اپنی آسانی کے لیے خود ہی ان کے ٹکڑے بنا

لیے ہوں گے۔ اور شاید یاد رکھنے کے لیے اور ان کے وزن کی پہچان کے لیے ان پر کوئی نشان ڈالنا شروع کر دیا ہوگا تاکہ انہیں آسانی سے پہچانا جا سکے۔

اب کیا ہوا ــــ؟

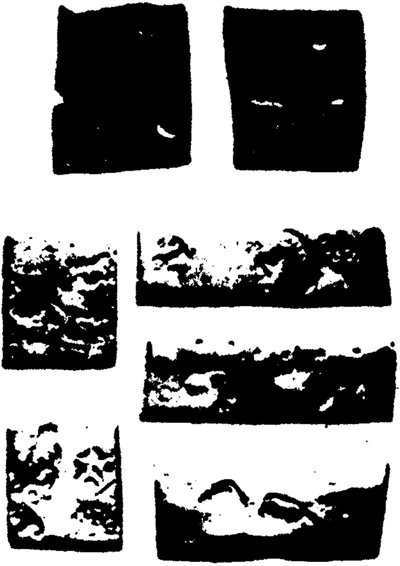

تانبے کی پتیاں جن پر نشان بنے ہیں

آدمی دوکان پر گیا، سامان لیا اور سُتّے ہوئے ٹکڑے گن کر دے دیے۔ اگر دکان دار نے چاہا تو کوئی ٹکڑا تول لیا ــــ سونے چاندی کے ٹکڑے ضرور تولے جاتے ہوں گے۔ اسی لیے جتنے بھی سونے چاندی کے ایسے پرانے ٹکڑے ملے ہیں ان کی شکل ایک سی نہیں ہے۔ تول میں اگر کوئی ٹکڑا زیادہ ہوا تو ایک کونا کاٹ دیا۔

بڑے بڑے بیوپاریوں نے اپنے

چاندی کے کٹے ہوئے ٹکڑے

کچھ نشان مقرر کر لیے ہوں گے — جیسے پھول (✿) یا پتّا (♠) یا کچھ اور — وہ اپنے ٹکڑوں پر ایک ٹھپا لگا دیتے ہوں گے۔

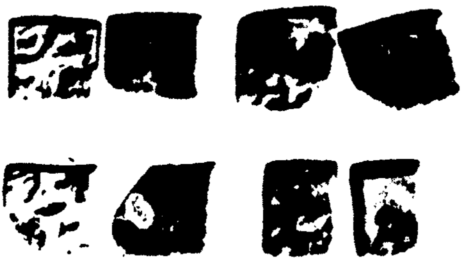

پرانے سِکّے جن پر کچھ نشان صاف نظر آسکتے ہیں

خود ہمارے ملک میں بھی ایسے سکّوں کے نام تک بہت پرانے زمانے میں موجود تھے۔ ویدوں میں 'نشکا' اور 'سورنا' نام کے دو سونے کے سکّوں کا ذکر ملتا ہے۔

خیر بھائی! تو ہوا یہ کہ ان نشانوں کی وجہ سے مجھ میں ایک بہت بڑی تبدیلی آگئی۔ میں 'تول' کے چکّر سے آزاد ہو کر 'گنا' جانے لگا — مجھے کبھی کبھی تولا بھی جاتا تھا، لیکن عام طور پر میرے گن لینے کے بعد ہی لوگوں کو اطمینان ہو جاتا تھا۔ اور جانتے ہو یہ کتنی بڑی بات تھی میری زندگی میں —؟ پہلے میں صرف "دھات" تھا، مگر اب میں اپنے آپ کو "سکّہ" کہہ سکتا تھا — اب میری اپنی بھی ایک صورت تھی۔

میں تمھیں پھر یاد دلا دوں کہ یہ باتیں کسی ایک خاص جگہ نہیں ہوئی تھیں۔ یہ تو دنیا کی ہر آبادی میں تھوڑے بہت وقفے سے چلتی رہیں مگر پھر بھی شاید روم میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی آٹھ نو سو سال پہلے دھات کے ایک سے وزن کے ٹکڑوں کو کاٹ کر رکھنا شروع کر دیا گیا تھا۔

عام طور پر دنیا میں میری سب سے پرانی دھات والی شکل یہی مانی جاتی ہے۔ مگر اب کچھ عرصے سے تاریخ کے بعض ماہروں کا خیال تھوڑا سا بدل رہا ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ ابھی کوئی چالیس پچاس سال پہلے سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں زمین سے کھود کر کچھ بہت پرانی بستیوں کے نشان نکالے گئے ہیں ــــ ان کے نام رکھے گئے ہیں ہڑپا اور موہنجوڈارو۔ ان کے نام تم پہلے بھی سن چکے ہو۔

ان بستیوں کے کھنڈروں اور ان چیزوں کو جو وہاں دبی ہوئی ملی ہیں انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے لوگ کتنی ترقی کر چکے تھے۔ ان شہروں کے متعلق تاریخ دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ اب سے کچھ کم پانچ ہزار سال پہلے آباد تھے۔

ان شہروں میں جو چیزیں ملی ہیں ان میں مٹی اور کچھ مسالوں کی چند مہریں بھی ہیں، جو بہت صاف صاف کھدی ہوئی ہیں اور ان پر اس زمانے کی زبان میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ اس زبان کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

تو بھائی تاریخ کے کچھ ماہروں کا خیال یہ ہے کہ یہ مہریں اور دھات کے کچھ ٹکڑے وہاں اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے آج کی دنیا

میں سکّے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کو کہنے میں مشکل یہ ہے کہ چوں کہ ان پر لکھی ہوئی زبان ابھی ٹھیک طرح سے نہیں پڑھی جاسکی اس لیے اس بات کا کوئی پکّا ثبوت موجود نہیں ہے۔

اسی لیے دنیا کے بہت سے تاریخ داں میری سب سے پُرانی دھات کی شکل، انہی روم میں چلنے والے دھات کے ٹکڑوں کو مانتے ہیں جن کے متعلق میں نے ابھی تمھیں بتایا۔

ایسا لگتا ہے کہ جلدی ہی میرا رواج ساری دنیا میں پھیل گیا۔ ہندستان میں میری یہ شکل جو روم کے لوگوں نے مجھے دی تھی روم کے سکوں کے کوئی دو تین سو سال بعد یعنی حضرت عیسیٰ سے لگ بھگ چھ سو سال پہلے ہندستان کے لوگوں کے ہاتھوں میں

ہندستان کے چاندی کے کچھ ٹکڑے جن پر نشان موجود ہیں

بھی نظر آنے لگی۔ اسی زمانے کے چاندی کے کچھ ٹکڑے جن پر نشان بنے ہوئے ہیں ملے ہیں۔ ہندستان میں شاید میری سب سے پرانی شکل یہی ہے۔

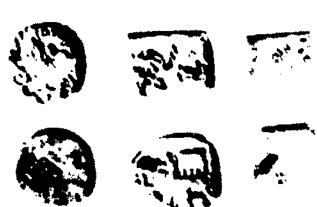

پھر کچھ اور بعد کے زمانے کی، سونے اور چاندی کی، کچھ وزنی پٹیاں بھی ملی ہیں۔ یہاں بھی شروع شروع میں میرے لیے چوکور شکل کو ہی پسند کیا گیا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ گول ہوتا چلا گیا۔ عام طور پر شروع میں مجھے دھات کو کوٹ کوٹ کر بنایا جاتا تھا۔ بس دھات کو چپٹا کیا اور اس پر کوئی نشان بنا دیا۔ مگر جب دھات خوب اچھی طرح پگھلائی جانے لگی تو مجھے سانچوں میں ڈھال کر اور خوب صورت کر دیا گیا۔ اب اپنی آسانی کے لیے کبھی کبھی لوگ مجھے عجیب عجیب شکلیں بھی دے دیتے۔ مثال کے طور پر اگر ایک سکّے کو دوگنا کرنا ہوا تو دو سانچے جوڑے اور ان میں پگھلی ہوئی دھات بھر دی۔ لیجیے ـــ میری جُڑواں شکلیں بھی پیدا ہونے لگیں۔ ہندستان ہی میں میری جُڑواں شکلیں بھی مل جاتی ہیں۔

ہندستانی جُڑواں سکّے

اس زمانے میں ہندستان میں میرے نام کچھ اس طرح تھے ـــ کوئی پچاس گرام چاندی کی ایک پتّی کا نام "ستمانا" تھا۔ پھر چاندی اور تانبے کو ملاکر سکّے بنائے گئے تھے۔ ان کو "پانا" یا "کرساپانا" کہا جاتا تھا۔ یہ "ستمانا" کے آدھے، چوتھائی یا آٹھویں حصّے کے ہوتے تھے۔ ان سے بھی چھوٹے سکّے صرف تانبے کے ہوتے۔ ان میں سے ایک کا نام تھا "ماسا" جو "پانا" کا سولھواں حصّہ ہوتا تھا۔ اس "ماسا" کا بھی ایک چوتھائی حصّہ موجود تھا۔ اس کا نام تھا "کاکینی" اور پھر اگر اور بھی چھوٹی ریزگاری کی کسی کو ضرورت ہوتی تو وہی کوڑی کام میں آتی جسے تم پہلے سے جانتے ہو۔

اب ایک بار پھر تم اپنے ذہن میں اس بات کو صاف کر لینا کہ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت تک سِکّہ کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں پہنچا تھا — بس تاجر، سُنار اور خرید فروخت کرنے والے مجھے بناتے اور دوسروں کے بنائے ہوئے سکّوں کو اپنا اطمینان کرنے کے بعد لیتے۔

دربار کی رونق

اور صاحب اس کے بعد سے تو میری ترقی کی ایسی کہانی شروع ہوتی ہے کہ اس پر میں خود بھی پھولا نہیں سماتا۔ جس دن سے بادشاہوں کی نظر مجھ پر پڑی میری تو دنیا ہی بدل گئی۔ دربار میں مجھے کیا عزت ملی تم کیا جانو! بس اس پرانی کہاوت سے سمجھ لو کہ "اس جگہ تو فلاں کا سکہ چلتا ہے۔"

اگر سچ پوچھو تو کسی بادشاہ کی حکومت اور سرحد کی پہچان ہی یہ تھی کہ کہاں تک اس کا سکہ چلتا ہے۔

اس پر ایک قصہ یاد آیا جسے سن کر تمھیں یقین آجائے گا کہ بادشاہ تخت پر بیٹھتے ہی اپنی بادشاہت کی پہچان کے لیے سکے کو کتنی عزت دیتے تھے۔

سنا ہے ایک بار ہمایوں بادشاہ دریا میں ڈوب رہا تھا۔ کنارے پر ایک بھشتی کھڑا پانی بھر رہا تھا۔ اس نے جو بادشاہ کی چیخیں سنیں تو مدد کے لیے دوڑا۔ اس نے اپنی مشک میں ہوا بھر کر اس کے منہ کو کس کے باندھ دیا اور جلدی سے بادشاہ کی طرف پھینک دیا بس بادشاہ اس

کے سہارے سے بچ گیا۔

بھشتی نے بادشاہ سے ایک وعدہ لیا۔ وہ یہ کہ جب موقع ہوگا تو ہمایوں ایک دن کے لیے بھشتی کو بادشاہ بنا دے گا۔

اب جناب ہمایوں اپنے وعدے کا پکا نکلا، اس نے بھشتی کو ایک دن کے لیے سارے ملک کا بادشاہ بنا دیا۔ بس اپنی ایک دن کی بادشاہت میں بھشتی نے اور کچھ کیا یا نہ کیا، اپنی بادشاہت کی نشانی کے طور پر ایک کام ضرور کیا ـــــ وہ یہ کہ اپنی مشک کو کٹوا کر اس کے چمڑے کے سکے چلوا دیے۔

تو بھائی اگر یہ کہانی سچی ہے تو پھر دنیا میں میری یہ ایسی شکل ہوگی جو نہ اس سے پہلے کبھی چلی نہ اس کے بعد لوگوں کے ہاتھوں میں آئی۔

شاہی سکے کی عزت کا تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی اسے لینے سے انکار کر دیتا تو اسے باغی سمجھا جاتا ـــــ اور یہ بات تو آج بھی ویسی ہی ہے۔ سرکاری سکے کو لینے سے انکار کرنا آج بھی قانونی جرم ہے۔

سب سے پہلے مجھے جس حکومت نے پیار سے اپنے دربار میں رکھا وہ ایشیائے کوچک کے اس علاقے میں تھی جہاں آج کل ترکستان وغیرہ کا علاقہ ہے۔ یہ حکومت حضرت عیسیٰ سے کوئی آٹھ سو سال پہلے سے شروع ہو کر لگ بھگ ساڑھے پانچ سو سال پہلے تک رہی۔ اس ملک کو اس زمانے میں "لیڈیا" کہتے تھے۔

تاریخ میں یہی حکومت سب سے پہلی ایسی ملتی ہے جس نے مجھے پیار کیا۔ بڑے بڑے تاریخ داں یہ مانتے ہیں کہ پہلا بادشاہی سکہ اس

خاندان کے آخری بادشاہ 'کروسس' نے چلایا تھا۔ اس کے سکّے سونے یا چاندی کی ایک پتری ہوتے تھے جس کے ایک طرف شیر کا چہرا ہوتا تھا اور اس کے بالکل سامنے ایک بیل کا۔

لو بھائی! میں چل نکلا — بالکل باقاعدہ طور پر، لگ بھگ اسی شکل میں جس میں میں آج تمھارے ہاتھوں میں ہوں — اس طرح میں یا میرے باپ دادا آج سے کوئی ڈھائی ہزار برس پہلے ایک دربار سے نکل کر عام لوگوں کے ہاتھوں میں آگئے۔

پہلا بادشاہی سکّہ

بس ایک سو دو سو سال میں ہی ہندستان کے کچھ حصّوں میں میں اپنے درباری روپ میں نظر آنے لگا۔ تمھیں یاد ہو گا کہ حضرت عیسیٰ سے کچھ اوپر تین سو سال پہلے یونان کے ایک بہت بڑے بادشاہ سکندر نے ہمارے ملک کے شمال مغربی حصّے پر حملہ کیا تھا۔ سکندر اپنے ملک میں بڑے خوب صورت سکّے چلاتا تھا۔ وہ سکّے ہندستان بھی آگئے۔ سکندر تو واپس چلا گیا مگر اس علاقے کی ریاستوں نے کچھ ویسے ہی سکّے چلانے شروع کر دیے۔

سکندر کی واپسی کے بعد شمالی ہندوستان میں ایک بہت بڑی حکومت قائم ہوئی۔ یہ ہماری تاریخ کی سب سے پہلی اتنی بڑی حکومت تھی۔ اس حکومت کے سب سے پہلے بادشاہ کا نام تھا 'چندر گپت موریا' اسی بادشاہ کا ایک بڑا قابل اور لائق پوتا تھا جس کا نام تم نے ضرور سنا ہو گا — اشوک — جسے بعد میں لوگ اشوکِ اعظم کہنے لگے۔

بڑے بڑے تاریخ دانوں کا خیال یہ ہے کہ میرا پہلا درباری روپ انہی دادا پوتوں کے زمانے میں کبھی عام ہوا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس زمانے کے

سکے بہت زیادہ نہ مل سکے۔

مگر جنوبی ہندستان میں میری ترقی ذرا دیر سے شروع ہوئی۔ یہاں میں اپنی اس شکل میں — جس میں مجھے سنار گڑھتے تھے — حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لگ بھگ دو سو سال بعد تک چلتا رہا۔ اور اس قسم کے سکے بھی جنوبی ہندستان میں شمالی حصّے کے مقابلے میں ذرا بعد میں ہی شروع ہوئے تھے۔ پھر بھی جنوبی ہندستان میں پرانے سے پرانے دھات کے ٹکڑے — خاص طور پر تانبے کے — جو بالکل سکّوں جیسے ہی ہوتے تھے، پانچویں صدی قبل مسیح تک کے مل جاتے ہیں۔

اور بس میرا ایک دربار سے نکلنا تھا کہ دنیا کے ہر بادشاہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آنکھوں پر بٹھایا، سونے چاندی کے علاوہ اور بہت سی دھاتوں کو ملا کر ان کے سکے بنوائے۔

یونان اور روم کے بادشاہوں نے برونز کے سکے بنوائے — اسی دھات کا ایک پیسے کا گول سکّہ آج کل بھی کبھی کبھی تمھارے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ اٹلی اور چین میں بھی لگ بھگ اسی زمانے کے برونز کے سکے مل جاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ساری دنیا ہی اس دھات کو اپناتی چلی گئی۔

سیسے کو میرے لیے بہت کم بادشاہوں نے پسند کیا۔ مگر جنوبی ہندستان میں آندھرا خاندان کی حکومت نے اسے بھی نہ چھوڑا اور کالی دھات کے لباس میں بھی میں تمھارے ہاتھ میں آیا۔

نِکل کو سب سے پہلے ایران کے ایک خاندان نے عزت بخشی۔ اس خاندان کو بختری کہتے تھے اور اس کی حکومت اب سے کوئی اکیس سو سال

پہلے تھی۔ پھر یہ چمک دار چاندی جیسی دھات انسان کو کچھ ایسی بھلی لگی کہ اس نے آج تک اس کا استعمال نہ چھوڑا۔ آج بھی ہماری جیب میں پچیس پیسے، پچاس پیسے اور ایک روپے کے سکے اسی دھات کے ہوتے ہیں۔

ان دھاتوں کے علاوہ ایک اور ملی جلی دھات میرے بنانے میں استعمال کی گئی۔ اس کو 'الیکٹرم' کہتے ہیں۔ یہ چاندی اور سونے کا میل ہوتی ہے۔ یعنی چاندی اور سونا کچھ اس طرح ملے ہوتے ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس دھات کے سب سے پہلے سکے تو 'لیڈیا' ملک کے ہی ملتے ہیں، جس کا حال تم نے پہلے ہی سُن لیا ہے۔ بعض جگہ تو یہ دھات قدرتی طور پر مل جاتی تھی، لیکن بعد میں مصنوعی طور پر بھی اس کا رکب تیار کیا جانے لگا۔

تم اگر میری اس زمانے کی شکلوں کو ذرا غور سے دیکھو تو ان میں تمھیں لگ بھگ ساری باتیں ایسی ملیں گی جیسی آج کے سکّوں میں ملتی ہیں۔ میں تمھیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ شروع شروع میں لوگ اپنے دھات کے ٹکڑوں پر کچھ ایسے نشان کھود لیتے تھے جن کا یا تو کوئی خاص مطلب نہ ہوتا تھا یا آج ہم اسے سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن بعد میں جب یہ دھات کے ٹکڑے باقاعدہ سکے بنے تب بھی ان پر بہت سے ایسے نشان باقی رہ گئے جن میں سے کچھ نشانوں کے بہت دل چسپ مطلب نکلتے ہیں۔

شروع شروع کے سکوں پر جانوروں کی شکلیں بہت نظر آتی ہیں — شاید ہر جگہ ہی انسان نے کچھ جانوروں کو مذہبی اعتبار سے کچھ عزت دی ہے جیسے گائے کو ہندستان میں ہمیشہ سے مقدس

مانا گیا ہے۔ پرانے پرانے سکوں پر جانوروں کی شکلیں ملنے کی شاید یہی وجہ ہے۔ گائے بیل کے علاوہ شیر گھوڑے اور ہاتھی کی تصویریں بھی بہت نظر آتی ہیں۔ یہ شاید بادشاہ کی بہادری اور شان و شوکت دکھانے کے لیے بنائی جاتی ہوں گی۔ آج بھی ہمارے کچھ سکوں اور نوٹوں پر شیر کی تصویر موجود ہے۔

بارہ سنگھا

ان کے علاوہ کچھ شکلیں تو سکوں پر ایسی بھی ملتی ہیں جو تمہیں ضرور عجیب لگیں گی۔ جیسے الو کی شکل یونان کے پرانے سکوں پر نظر آتی ہے۔ جی ہاں وہی الو جسے تم بے وقوف سمجھتے ہو اور غصے میں اپنے دوست کو "الو" کہہ دیتے ہو — یونان میں لوگ اس کو عقلمندی کا نمونہ مانتے تھے۔ پھر پھل، پھول، شہد کی مکھی، بارہ سنگے اور خوب صورت چڑیوں کی تصویریں بھی سکوں پر نظر آجاتی ہیں۔

ہاتھی اور درخت

گھوڑا اور درخت

جانوروں کے علاوہ کھیتی باڑی کے بھی بہت سے نشان میری پرانی شکلوں پر نظر آجاتے ہیں۔ بعض ملکوں میں پیدا ہونے والے خاص خاص

درخت، گیہوں کی بالیں، مختلف پودے وغیرہ۔ گیہوں کی بال لوگوں کی خوش حالی کا پتہ دیتی ہے، اور آج بھی ہمارے سکوں پر موجود ہے کوئی بھی ایک روپیے کا نوٹ اٹھا کر دیکھ لو، تمھیں یہ ضرور نظر آجائے گی۔

مہاتما گوتم بدھ نے برگد کے نیچے بیٹھ کر عبادت کی اور زوان حاصل کیا تھا۔ ان کے بعد صدیوں تک بہت سے سکوں پر برگد کے پیڑ کی شکل بنائی گئی۔ ہندوستان ہی کیا چین، برما، لنکا اور جہاں جہاں بھی بدھ مت پھیلا، وہاں اس درخت کی تصویر میرے چہرے پر نظر آئی۔ آج اپنے دس روپے کے نوٹ کو غور سے دیکھو تو تمھیں اس پر بھی ایک درخت نظر آجائے گا۔

میرے اوپر انسانی شکلیں کچھ ذرا بعد میں آئیں اور جب آئیں تو ایسی کہ پھر نہ ہٹ سکیں۔ آج بھی جن ملکوں میں بادشاہوں کا راج ہے وہاں کے سکوں پر بادشاہوں کی تصویر ہوتی ہے۔

ابھی خود ہمارے آزاد ملک میں بھی روپیے اور پچاس پیسے کے سکے ایسے چلے ہیں جن پر چاچا نہرو کی تصویر نظر آتی ہے۔ اور ۱۹۶۹ء میں جب مہاتما گاندھی کی پیدائش کی سوئیں سالگرہ منائی گئی تو گاندھی جی کی تصویر والے سکے بھی چلائے گئے۔

پنڈت نہرو کی تصویر والے سکے

مگر ان سکوں کی تصویروں اور بادشاہوں کی تصویروں میں فرق ہے۔ بادشاہ اپنی شان وشوکت اور نام کے اظہار کے لیے سکوں پر تصویر بنواتے تھے اور ہمارے یہاں پنڈت جی اور گاندھی جی کی موت کے بعد ان کی یاد منانے کے لیے سکوں پر ان کی تصویر بنوائی گئی۔

ویسے انسانی شکل سب سے پہلے جزیرہ صقلیہ، جس کو انگریزی میں "سسلی" (SICILY) کہتے ہیں، یہاں کے سکوں پر نظر آئی۔ یہ شکل ایک بہت خوب صورت عورت کا چہرہ ہے جو اس زمانے میں ایک چشمے کی دیوی مانی جاتی تھی۔ اس دیوی کا نام تھا "آرتھیوسا" اس سکے کے ایک طرف آرتھیوسا کا چہرہ ہے اور دوسری طرف بہت سے پیروں والے ایک گھوڑے کی تصویر ہے یہ سکے تقریباً پانچویں صدی قبل مسیح میں چلتا تھا

آرتھیوسا کی تصویر والا سکہ

سکندر کے سکوں نے ہندوستان کے سکوں پر بھی اثر چھوڑا۔ اس کے سکوں پر اس کی بہت خوب صورت تصویر ہوتی تھی ـــــ بس جلدی ہی ہمارے ملک کے سکوں پر بھی تصویر نظر آنے لگی۔

تم نے ابھی سنا تھا کہ ہندستان میں میری پہلی درباری شکل موریا خاندان کی حکومت کے زمانے میں نظر آئی تھی۔ اس کے بعد ہمیں ہندستان میں ایک اور بڑی حکومت نظر آتی ہے۔ اس خاندان کو "کشان"

کہتے ہیں۔ اس کے سب سے بڑے بادشاہ کا نام تھا 'کنشک'! یہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے ۷۸ سال بعد تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے سونے کے بڑے خوب صورت سکّے چلائے جن پر اپنی اور کچھ دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنوائیں۔ شاید اس زمانے میں چاندی سونے سے کچھ کم تھی ہندستان میں — اسی لیے اس زمانے کے سونے اور تانبے کے سکّے کچھ زیادہ ملتے ہیں۔

کُشان خاندان کی حکومت کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جسے ہم اپنے ملک کی تاریخ کا 'سنہری زمانہ' کہتے ہیں۔ یہ ہے گپتا خاندان کی حکومت — اس کو 'سنہری زمانہ' اس لیے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں صرف بادشاہوں کی حکومت ہی اتنی بڑی نہیں تھی اور خزانے میں صرف سونا چاندی ہی اتنا بھرا ہوا نہیں تھا بلکہ اسی زمانے میں ہندُستان میں اور بھی بہت سے بڑے بڑے کام ہوئے۔ اگر ایک طرف بہت بڑے بڑے عالم فاضل موجود تھے تو دوسری طرف پتھروں کو کھود کھود کر ان سے بہت اچھی اور خوب صورت مورتیاں بنانے والے بھی پیدا ہوئے۔

— پھر جب اور باتوں میں اتنی ترقی ہو تو میں تو بادشاہوں کا چہیتا ہوں — میرے ذریعہ ہی تو ان کی بڑائی کا پتہ چلتا تھا — چناں چہ گپتا خاندان کے بادشاہوں نے بہت بہت خوب صورت سکّے چلائے۔ اب ان کے سانچوں کی کھدائی بہت خوب صورت ہوئی، گولائی بھی بالکل ٹھیک۔ بادشاہوں اور دیوی دیوتاؤں کی صاف اور خوب صورت شکلیں مجھ پر نظر آئیں۔ دیویوں میں لکشمی کو — جو

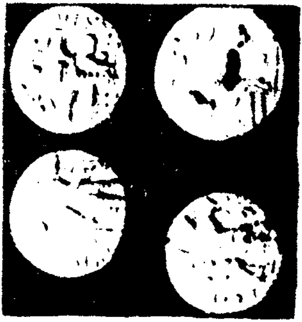

گپتا خاندان کے سکے

دولت کی دیوی مانی جاتی ہے — میرے لیے پسند کیا گیا۔ گپتا خاندان کی حکومت کے بعد ہمارے ملک میں کئی سو سال کا زمانہ کچھ گڑ بڑ کا زمانہ رہا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں میرے ساتھ بھی کچھ اچھا سلوک نہ ہوا ہوگا۔

پرانے زمانے میں میری قسمت تو بادشاہوں کے ساتھ لکھی تھی — بادشاہ کے پاس دولت ہوتی تو میرے لیے سونے اور چاندی کے کپڑے بنتے، دولت کم ہوتی تو مجھے تانبے پیتل کا لباس ملنے لگتا، اور میری صورت مرجھا سی جاتی۔ اور بھائی ان تین چار سو سالوں میں مجھ پر کچھ ایسی ہی بیتی۔ اب نہ وہ سونے چاندی کا قیمتی لباس تھا، نہ مجھ پر وہ خوب صورت تصویریں تھیں۔

میری کہانی کا اگلا خاص حصہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے مسلمان ہندستان میں آئے۔ عرب تاجر تو اور پہلے بھی ہندستان آتے تھے مگر وہ صرف بیوپاری ہی تھے۔ محمد بن قاسم اور اس کے بعد محمود غزنوی نے بھی بس حملے ہی کیے — کوئی بہت بڑی حکومت ہندستان میں قائم نہیں کی۔

ہندستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں قائم کی اور اس کے بعد اس کے جانشین قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنی حکومت کی راج دھانی بنایا۔

محمد غوری سے پہلے کئی سو سال مجھ پر عجیب غربت میں گزرے۔ میں کہیں سونے کے لباس میں نظر ہی نہ آتا۔ میری پرانی خوب صورت شکلوں کو بھی لوگوں نے شاید اس لیے اپنے گھروں میں چھپا کر رکھ لیا تھا کہ کوئی انھیں ان سے چھین نہ لے۔ اس زمانے میں اگر کسی بادشاہ نے میری بہت خاطر کی تو بس اتنی کہ اور دھاتوں میں تھوڑی سی چاندی ملا کر میرا لباس بنوا دیا۔

ویسے تو خیر محمود غزنوی نے بھی اپنے ہندستانی علاقے کے لیے کچھ سکے چلوائے تھے، جن پر عربی کے ساتھ یہاں کی زبان —— ہندی —— میں بھی لکھائی ہوتی تھی۔ مگر یہ سکے بھی اس وقت کے عام ہندستانی سکوں کی نقل ہی ہوتے۔ مگر محمد غوری نے ہندستان کو اپنا ملک سمجھ کر اس میں نئی نئی چیزیں شروع کیں۔ اس نے سونے چاندی کے خوب صورت سکے بھی چلائے، جو بالکل ایسے ہی تھے جیسے اور مسلمان بادشاہ اپنے ملکوں میں چلاتے تھے۔

دنیا کے جس ملک میں بھی مسلمان بادشاہ ہوئے وہاں کے سکوں میں ایک نئی بات ضرور پیدا ہوئی —— وہ یہ کہ سکوں پر سے تصویریں غائب ہو گئیں۔

مگر جہاں تصویریں ہٹنے سے میری خوب صورتی میں فرق آیا وہاں ایک بڑا فائدہ بھی ہوا —— خاص طور پر تاریخ پڑھنے والوں کو تو ایک نیا راستہ ہی مل گیا معلومات حاصل کرنے کا۔

بات یہ ہوئی کہ تصویر کے ہٹ جانے سے سکے پر بہت سی جگہ خالی ملنے لگی۔ بس اس جگہ کو بادشاہوں نے خوب خوب استعمال کیا۔

- اپنے نام لکھوائے، سنہ اور سال لکھوانے کا خاص خیال رکھا، جس شہر میں ٹکسال تھی اس کا نام بھی لکھوایا۔

تم جانتے ہو اس سے کتنا فائدہ ہوا؟ بس یوں سمجھ لو کہ ایک پرانا سکہ ملا تو بادشاہ کا پورا نام مل گیا، سال اور زمانے کا ثبوت ملا، ٹکسال والے شہر کے نام سے پتہ چلا کہ اس بادشاہ کی حکومت کہاں تک تھی —— اور ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں تاریخ پڑھنے والوں کے لیے بڑی کارآمد ہیں۔

اب ذرا دیکھو کہ اس سکے میں کتنا کچھ لکھا ہوا ہے۔

محمد بن تغلق کا ایک سکہ

تحریر: (سیدھے ہاتھ کی طرف کا)

اَشھدُ اَن لا الٰہ الا اللہ و اَشھدُ اَنّ محمد عبدہ و رسولہ

(بائیں ہاتھ کی طرف

باہر کے دائرے میں) ضربَ ھذ الدینار بحضرت دھلی فی سنۃ سبع مائۃ و ستّ وعشرین

(ترجمہ: اس دینار پر دہلی کے حضور میں سنہ سات سو چھبیس (ہجری) میں مہر لگائی گئی۔)

(اندر کے دائرے میں) الواثق بتائید الرحمٰن محمد شاہ السلطان

اور میرا اپنا فائدہ اس میں یہ ہوا کہ پرانا ہو کر بھی میری عزت اور بڑھی۔

محمد غوری کے زمانے سے لے کر پہلے مغل بادشاہ —— بابر ——

تک میری کہانی میں سوائے اس نئی بات کے اور کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ بڑے بڑے طاقت ور بادشاہ ہوتے تھے، خزانے سونے چاندی سے بھرے ہوئے اس لیے مجھ میں کوئی خاص تبدیلی پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔

سکّے

اس عرصے میں صرف ایک بادشاہ ایسا آیا جس نے میری صورت کو بدلنا چاہا — لوگ اس کے اس کام کو حماقت کہتے ہیں۔ مگر میں اسے اس معاملے میں اتنا بے وقوف نہیں مانتا، حالاں کہ اس وقت کے لحاظ سے تو اس نے مجھ پر زیادتی ہی کی تھی۔ مگر تم دیکھو گے کہ بعد میں وہی ہوا جو وہ کرنا چاہتا تھا — اچھا، تو سنو اس کی کہانی۔

اس بادشاہ کا نام تھا محمد بن تغلق — ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اس بادشاہ کے ایک سکّے کی شکل تمھیں دکھائی ہے۔ اس بادشاہ نے ہندستان پر ۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۱ء تک حکومت کی ہے۔

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ اس زمانے میں میں زیادہ تر سونے چاندی کا لباس پہنا کرتا تھا۔ تغلق کے سونے کے سکّے کا نام تھا "ٹنکہ" ایک ٹنکے میں جتنا سونا لگتا تھا اس کا اگر صرف سونا بھی بازار میں بیچا جاتا تو وہ سونا بھی اتنا ہی سامان خریدتا جتنا ایک "ٹنکہ" خرید سکتا تھا۔ اسی اصول پر میں ساری دنیا میں اب تک چل رہا تھا۔

اس بادشاہ نے سوچا اور صحیح سوچا — کہ سکّے کا کام صرف اتنا ہی تو ہے کہ وہ چیزوں کے لین دین کو آسان کر دے۔ چاہے وہ سونے کا ہو

یا تانبے کا، اس سے سامان کے خریدنے میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب اگر کوئی حکومت یا بادشاہ ملک کے لوگوں سے کہہ دے کہ دیکھو بھائی، اب تم سونے کے 'ٹنکے' کے بجائے تانبے کا 'ٹنکہ' کام میں لاؤ تو خرید و فروخت میں تو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے!

اب ذرا فرض کرو کہ سونے کے ایک 'ٹنکے' سے بیس من گیہوں ملتا ہے۔ اگر تانبے کے ٹنکے سے بھی ملک بھر میں بیس من گیہوں ملنے لگے تو سونے کا 'ٹنکہ' بنانے کی کیا ضرورت رہ جائے گی—؟

میں تو ہمیشہ سے یہی کہتا آیا ہوں کہ میرے اندر لگی دھات کی قیمت سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا— بس اس غریب بادشاہ کا قصور یہی تھا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں اس وقت آگئی تھی جب لوگ ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتے تھے— دیکھ لو آج ساری دنیا اس بات کو مان گئی ہے۔ تم خود کاغذ پر چھپا ہوا سو روپے کا نوٹ جیب میں لیے پھرتے ہو جب کہ اس کاغذ کی اپنی قیمت ایک پیسے برابر بھی نہیں ہے— یہ تو صرف اعتبار کا سودا ہے۔ جب تک تم کسی سکّے پر یہ اعتبار رکھتے ہو کہ یہ اتنا سامان خریدے گا جتنا پہلے خریدتا تھا تو پھر چاہے وہ سونے کا ہو یا چاندی کا، یا تانبے کا، بلکہ کاغذ کا بھی ہو تب بھی وہ اتنا ہی اچھا ہے جتنا پہلے تھا۔

اب بادشاہ کی بات—! جو سمجھ میں آجائے اس کے دماغ سے اتارے کون؟ بس اس نے تانبے پیتل کے سکّے ڈھلوا لیے— اس سکّے میں لگے تانبے، پیتل کی قیمت تو بہت کم ہوگی!؟ مگر حکم یہی تھا کہ اس کے بدلے میں سامان اتنا ہی خریدا اور بیچا جائے جتنا سونے کے ٹنکے کے

بدلے میں خریدا اور بیچا جاتا تھا۔

خیر چلنے کو تو چل پڑا یہ سکّہ۔ بادشاہ کا حکم نہ ماننے کی ہمّت کس میں تھی! مگر گڑ بڑ بہت بڑھ گئی۔ لوگوں نے اپنے گھر کے برتن تک پگھلا کر جھوٹے سکّے ڈھلوا لیے۔ اب پُرانے سونے کے سکّے تو لوگوں نے گھروں میں چُھپا لیے، اور تانبے پیتل کے سکّے — جھوٹے سچّے — ملک بھر میں گھومنے لگے۔ کچھ ہی دن بعد بادشاہی سکّوں کی جگہ ملک میں تگنے چوگنے سکّے موجود تھے۔

بس اس وقت تو اتنا ہی تمھیں بتا دوں کہ میں اگر کسی جگہ ضرورت سے زیادہ ہو جاؤں تب بھی خرید فروخت میں بڑی گڑبڑ پڑ جاتی ہے — چناں چہ کچھ دن بعد بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ "بھائی میرے سکّے مجھے واپس کر دو اور سونے کے سکّے لے جاؤ! لوگوں نے سکّے واپس کیے — سُنا ہے اس وقت تک اتنے جھوٹے سکّے ملک میں گڑھے جا چکے تھے کہ بادشاہ کے دربار میں کئی پہاڑیوں برابر تانبے پیتل کے سکّوں کے ڈھیر لگ گئے — مگر بادشاہ بھی بڑا ایمان دار تھا، وہ اپنے قول سے نہ پھرا اور جو شخص بھی تانبے پیتل کے سکّے لایا وہ ان کے بدلے میں سونے کے سکّے لے کر گیا۔

سُنی تم نے اس غریب بادشاہ کی کہانی! مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ یہ بادشاہ اپنے اس کام میں ناکام کیوں ہوا؟ جب کہ دنیا کے اور کئی ملکوں میں ایسی ہی کوشش کچھ اور بادشاہوں نے بھی کی اور بعض جگہ وہ کامیاب بھی ہوئے۔

مگر ہاں بھائی! میری ایک شکل تو تم نے ابھی دیکھی ہی نہیں — میری سب سے ہلکی شکل! تمھیں یاد ہے شروع میں مَیں نے تم سے کہا تھا کہ " میں ہوا میں اُڑ بھی سکتا ہوں اور پانی میں ڈوب بھی سکتا ہوں —" ابھی تک تو تم نے میری وہ شکل دیکھی جو پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ آؤ اب تمھیں اپنی وہ شکل دکھاؤں جو ہوا میں اُڑ بھی سکتی ہے — یعنی کاغذ —

مارکوپولو کا نام تو تم سُن ہی چکے ہو۔ یہ چین کے ایک بہت بڑے بادشاہ، قُبلائی خان کے دربار میں بہت دن رہا تھا۔ قُبلائی خان بادشاہ چنگیز خاں کی نسل سے تھا اور چین سے ایران کی سرحد تک اس کی حکومت تھی۔ جس بادشاہ کی کہانی ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے سُنی، قُبلائی خان اس سے کوئی تیس سال پہلے مرا ہے — تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ قبلائی خان کی حکومت میں چلنے والے کاغذی سکّوں — یعنی نوٹوں — کا ذکر مارکوپولو نے کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ ساری حکومت میں چلتے تھے۔ کسی کو اگر زیور یا کپڑا بنوانے کے لیے سونا یا چاندی چاہیے ہوتا تو وہ خزانے سے انھی نوٹوں سے خرید لیتا۔ یہ نوٹ بہت خوب صورت اور بالکل چوکور ہوتے اور اس پر بادشاہ کی مہریں لگی ہوتیں۔

چین کے کاغذی پیسے کو تو لوگ اور بھی پُرانا بتاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ وہاں تو نویں صدی عیسوی میں ہی کاغذی نوٹ موجود تھے۔ ویسے بھائی چوں کہ خود کاغذ بھی دوسری صدی عیسوی میں چینیوں نے ایجاد کر لیا تھا اس لیے ہو بھی سکتا ہے کہ وہاں کسی نہ کسی شکل میں کاغذی سکہ چلتا ہو۔

ابن بطوطہ کا نام تم نے سنا ہی ہے یہ افریقہ کے ایک ملک مراقش کا رہنے والا تھا اور اس کے دل میں گھومنے پھرنے کا کچھ ایسا شوق تھا کہ اس زمانے میں بھی جب ریل گاڑی تھی نہ ہوائی جہاز نہ اچھی اچھی سڑکیں تھیں، نہ بہت سے لوگ سفر ہی کرتے تھے، اس نے تقریباً آدھی دنیا کا چکر لگا ڈالا۔ اس کی تقریباً آدھی عمر بس گھومنے میں ہی گزری اور افریقہ اور ایشیا کے کتنے ہی ملکوں سے اس کا گزر ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس نے کم سے کم ۷۵ ہزار میل سفر کیا تھا۔ ایک اور اچھی بات یہ کہ اس نے صرف سفر ہی نہیں کیا بلکہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں کے حالات کو بڑے غور سے دیکھا اور بعد میں انھیں بہت اچھے ڈھنگ سے ایک کتاب میں لکھ دیا۔ اب تم خود ہی سمجھ لو کہ اس کتاب کے پڑھنے میں کتنا مزا آتا ہوگا، اور اس سے کتنا فائدہ پڑھنے والے کو ہوتا ہوگا۔

ابن بطوطہ ۱۳۳۳ء میں ہندستان بھی آیا، اور یہاں آکر تو اس کا ایسا جی لگا کہ وہ ایک طرح سے ہندستان کا ہی ہو کر رہ گیا۔ ۱۳۴۲ء میں ہندستان کے اسی بادشاہ محمد بن تغلق نے، جس کا قصہ تم پہلے سُن چکے ہو، اسے قاضی بھی بنا دیا۔

اس نے اپنے سفرنامے میں چین کی ایک ریاست گوآ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں ٹین کے سکے چلتے تھے۔ ریاست کے باہر کے بیوپاری ظاہر ہے انھیں نہ لیتے ہوں گے، چوں کہ ریاست کے باہر ان کی کوئی قیمت نہ تھی۔

تقریباً اسی زمانے میں چنگیز خاں کی نسل کے ایک اور بادشاہ

کیخاتو خان نے ایران میں بھی کاغذ کا نوٹ چلانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ناکام رہا۔

یہ تو ہوئیں مثالیں ایک دو ملکوں کی، جہاں کسی بادشاہ نے اپنے حکم سے سونے چاندی کے علاوہ کسی اور چیز کا سکّہ چلوا دیا ـــــ جب تک بادشاہ رہا وہ سکّہ بھی چلتا رہا، جب اس کا حکم نہ رہا تو وہ سکّہ بھی بند!

اب تم کہوگے کہ پھر یہ آج کاغذ کے نوٹ کہاں سے آگئے۔ آج تو بادشاہ بھی نہیں کہ جو سختی سے حکم دے دے اور ہم مجبور ہوں۔ اب تو ہم اپنی خوشی سے کاغذ کے نوٹ لیے پھرتے ہیں ـــــ یہ نوٹ کیسے آگئے ـــــ!؟

اچھا! تو سنو میرے اتنا ہلکا ہو جانے کی کہانی ـــــ مگر پہلے میں تمھیں چھوٹی موٹی دو ایک باتیں اور بتا دوں تاکہ تمھاری سمجھ میں آجائے کہ میرا وہ بوجھ کہاں اڑ گیا۔

چلو ایک بار پھر وہیں سے چلیں کہ جب کاغذی سکّہ نہیں چلتا تھا تب کیا حال تھا ـــــ؟ دنیا کے شاید سارے ہی بڑے سکّوں میں سونا استعمال ہوتا تھا۔

سونے کے بڑے سے بڑے سکّوں میں اکبر کے ایک "سہنسہ" نام کے سکّے کا ذکر ملتا ہے ـــــ یہ تقریباً ۱۰۱ تولے سونے کا ہوتا تھا۔ جہانگیر نے بھی اپنی بیوی نور جہاں کے نام سے ایک سکّہ "نور جہانی مُہر" نام کا چلایا تھا۔ یہ تقریباً ۵۰۰ تولے سونے کا تھا ـــــ نہ معلوم لوگ انھیں کیسے بازار لے جاتے ہوں گے ـــــ؟ مگر خیال یہ ہے کہ یہ سکّے خرید و فروخت کی

بجائے روپیہ جمع کرنے کے زیادہ کام آتے ہوں گے۔ کسی کے پاس بہت سے روپے یا سونا جمع ہوا تو اس نے یہ سکہ خرید لیا اور گھر میں دبا کر رکھ لیا۔

اس کے بعد جنوبی امریکہ کے ایک ملک 'بولیویا' کے سکے کا نمبر آتا ہے۔ یہ اب سے کوئی سو سال پہلے چلتا تھا۔ اس میں کوئی ساڑھے تین تولے سونا ہوتا تھا — یعنی آج کل کے روپیوں میں اس کی قیمت ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہوگی۔

سونے کے سکوں کے بعد چاندی کے سکوں کا نمبر آتا ہے، اور اس کے بعد چھوٹے سکوں کا، جنھیں تم ریزگاری کہتے ہو۔ یہ ظاہر ہے کم قیمت والی دھاتوں کے ہوتے تھے۔ مگر یہ بات تم جانتے ہی ہو کہ سارے سکوں کے بنانے میں اس بات کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ جتنی قیمت میں بازار میں چلتے ہوں تقریباً اتنی ہی قیمت کی دھات ان کے بنانے میں لگائی جائے۔

ایک بار پھر اسے یوں سمجھ لو کہ اگر سونے کا بھاؤ بازار میں پندرہ روپے تولہ تھا تو ایک تولہ سونے کے سکے سے بازار میں اتنا ہی سامان خریدا جا سکتا تھا — اب چاہے اس سکے یا اشرفی کو پندرہ روپے میں چلاتے رہو، چاہے اسے پگھلا کر سونے کو پندرہ روپے میں بیچ دو — بات برابر تھی

کاغذی لباس

اور بھائی، اب حال یہ ہے کہ اگر سو روپے کے نوٹ کے کاغذ کو بازار میں بیچنے جاؤ تو اُسے کوئی پُڑیا باندھنے کو بھی نہ لے۔ بس یہی بات اب میں تمھیں بتانے والا ہوں کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ مگر اب مجھے تمھیں تھوڑا سا اپنے گھر کے متعلق بھی بتانا پڑے گا۔

میرا گھر — ؟ تم کہو گے — اور ٹھیک ہی کہو گے — کہ وہ تو انسان کی جیب ہے! مگر آج کل کی دنیا میں مَیں انسانوں کی جیب کے علاوہ ایک اور بڑے گھر میں بھی رہتا ہوں — اسے بینک کہتے ہیں۔

بینک کے دو بڑے کام ہوتے ہیں، یا یوں کہوں کہ میرے گھر میں صرف دو کام ہوتے ہیں —

۱۔ لوگوں کو ادھار دینا اور اس پر کچھ سود لینا — اور
۲ لوگوں کا روپیہ تو جمع رکھنا، اس کی حفاظت کرنا تاکہ جب انھیں ضرورت ہو وہ اپنا روپیہ واپس لے سکیں

ادھار تو خیر مہاجن بھی دے دیتے ہیں مگر جب سے لوگوں کا روپیہ جمع رکھنے کا کام شروع ہوا اسی وقت سے کچھ ایسی نئی باتیں شروع ہوئیں کہ ان سے دنیا کی دولت میں ہی تبدیلی آنے لگی۔

اور اب تو اگر تم کسی بینک میں جاکر دیکھو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ تمھارے جمع کرائے ہوئے روپے پر تمھیں تھوڑا بہت سود بھی ملتا ہے۔ مگر پہلے ایسا نہیں تھا۔ پہلے تو بینک میں روپے جمع کرنے کی ایک فیس ادا کرنی پڑتی تھی یہ اس لیے کہ بینک تمھارے روپے پیسے کی حفاظت کرتا تھا۔

بینک تو خیر نہیں، مگر بینک کا کام خود بہت پُرانا ہے ــــ بابل اور مصر میں حضرت عیسیٰ سے کوئی دو ہزار برس پہلے وہاں کی عبادت گاہیں آج کل کے بینکوں جیسا کام بھی کرتی تھیں۔ ان مندروں سے نکلے ہوئے کچھ پتھروں پر کھدی ہوئی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے سونا چاندی اور غلّہ ادھار بھی دیا جاتا تھا اور لوگوں کا مال جمع بھی رکھا جاتا تھا۔

پھر کوئی ڈیڑھ ہزار سال بعد یونان کے مندروں نے بھی کچھ ایسا ہی کام کیا۔ خود ہندستان میں بھی بہت سے بیوپاریوں اور ایک سے پیشے میں کام کرنے والے لوگوں نے مل کر بہت پُرانے زمانے میں بینک کھولے تھے۔ مگر ان کے ممبر صرف وہی ہوتے تھے جو اس انجمن کے ممبر بھی ہوں۔

بینکوں کا دوسرا دور اور کچھ ایسا روپ جیسا آج نظر آتا ہے، یورپ میں اب سے کوئی سات آٹھ سو سال پہلے شروع ہوا۔ خیر مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ میری شکل دھات سے کاغذ میں کیسے بدل گئی ــ؟ تو سنو!

بڑے بڑے بیوپاری جو لاکھوں کی تجارت کرتے تھے، حفاظت کے خیال سے اپنا روپیہ بینکوں میں جمع کروا دیتے تھے ــــ جب ضرورت ہوئی بیوپاری بینک گیا اور روپیہ لے لیا۔ کچھ دن تو یوں ہی کام چلا۔ ہر روز بینک میں دس بیس آدمی روپیہ نکلوانے آتے ہوں گے اور دس بیس آدمی روپیہ جمع بھی کرا جاتے ہوں گے۔

ایک بات اور ـــــ تاجر جب کہیں جاتے تو انھیں ہزاروں روپیے لے جانے میں ، انھیں بار بار گننے میں بڑی دقت ہوتی ہوگی! بس کچھ دن بعد یہ طے پایا کہ بینک ہزاروں روپیے گن کر دینے کی بجائے ایک یا کئی کاغذوں پر ایسا ایک وعدہ لکھ کر دے گا:

"بینک وعدہ کرتا ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص یہ کاغذ بینک
میں لائے گا اُسے پانچ ہزار روپیے نقد دے دیے جائیں گے"

ایک اور کاغذ پر ایسا ہی وعدہ ایک ہزار روپیوں کے لیے لکھا ہے ۔ ایسے کئی کاغذ بیوپاری کو بینک نے دے دیے یا ان پر صرف رقم اور بیوپاری کے دستخط کے لیے جگہ چھوڑ دی ۔

تاجر نے سامان خریدا ، دستخط کیے اور وہ کاغذ دے دیا۔ لیجیے صاحب وہ بار بار گننے اور سکوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرنے سے بچا۔ دکان دار کو جب روپیے کی ضرورت ہوئی تو اس نے بینک سے روپیہ لے لیا۔ یا اگر اس کا روپیہ بھی اسی بینک میں جمع ہے تو اس نے یہ روپیے بھی وہیں جمع کرا دیے ۔

اب ضرور تمھاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کاغذ دھات کی جگہ کیسے آگیا ـــــ ایک طرف تو تاجروں کو یہ آسانی ہوئی کہ بینک سے نکالے بغیر ہی روپیہ ادا ہونے لگا۔ دوسری طرف بڑے بڑے بینکوں کا اعتبار ـــــ شہر کے اندر بھی اور شہر کے باہر بھی ـــــ لوگوں میں پیدا ہوتا چلا گیا ، اور لوگ بینک کے وعدوں پر بھروسا کرنے لگے ـــــ کبھی ایسا بھی ہوا کہ جب ایک آدمی کو ایسا کاغذ ملا تو اس نے دوسرے کو دے دیا ، دوسرے نے تیسرے کو دے دیا ، چوں کہ اسے بھی اس بینک کے وعدے پر بھروسا تھا ـــــ اور کاغذ کا

چکر چل پڑا۔

تم آج بھی اپنے بڑے نوٹ اٹھا کر دیکھو تو تمھیں ایسا ہی ایک وعدہ ان پر لکھا ہوا نظر آجائے گا۔

بس، پھر بعد میں خود حکومتوں نے ہی اپنے بینکوں کے ذریعے یہ نوٹ جاری کر دیے ــــ ہمارے ملک میں نوٹ جاری کرنے کا کام ہمارے سب سے بڑے بینک ــــ یعنی "ریزرو بینک" ــــ کے سپرد ہے۔

تو بھائی یہ ہے میری کاغذی شکل ــــ!

خوب صورت سکّے

آؤ اب ذرا پھر دیکھیں کہ پچھلے پانچ سو سال میں ہمارے ملک میں میری شکلوں میں کیا کیا فرق آیا۔

۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودی کو بابر نے ہرا دیا اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد چار سال بابر کے اور کوئی دس گیارہ سال اس کے بیٹے ہمایوں کے، کچھ اتنی پریشانی میں بیتے کہ اس زمانے میں میرے رنگ پر کوئی خاص نکھار نہ آیا— پھر بھی بابر اور ہمایوں دونوں کے دو سکّے خاص طور پر مل جاتے ہیں۔ ایک سونے کا سکّہ تھا جسے بابر نے "شاہ رخی" کا نام دیا تھا، دوسرا چاندی کا سکّہ تھا جس کا عربی نام "درہم" رکھا گیا تھا۔

پھر ایک افغان سردار شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو ہرا کر ایران کی طرف بھگا دیا اور پورے شمالی ہندستان پر حکومت شروع کر دی— یہ شیر شاہ سوری بھی کچھ ایسا قابل آدمی تھا کہ اس کی شروع کی ہوئی بہت سی باتیں آج تک ہندستان میں موجود ہیں— خیر بھائی، اور باتیں تو تم تاریخ کی کتابوں میں پڑھ سکتے ہو، ہم تو اپنی بات کریں۔

میری وہ شکل جو ابھی چند سال پہلے تک تم دیکھتے تھے وہ بس اسی بادشاہ کی دی ہوئی تھی۔ اسی نے وہ سکّہ چلایا تھا جس کا نام تم آج تک

لیتے ہو — یعنی "روپیہ"!

"روپا" لفظ تو سنسکرت کا ہے جس کے اور بہت سے معنوں میں سے ایک معنی — صرف چاندی — کے بھی ہوتے ہیں۔ شیر شاہ سے بہت پہلے یہ لفظ سکّوں کے لیے استعمال بھی ہوا ہے۔ تم نے پہلے چندر گپت موریا کا نام سُنا تھا۔ اس بادشاہ کا ایک بہت ہی قابل وزیر تھا جس کا نام تھا چانکیہ — اس وزیر نے حکومت کے قاعدے قانون کے بارے میں ایک کتاب "ارتھ شاستر" لکھی تھی۔ اس میں کچھ سکّوں کا بھی ذکر ہے۔ انہی میں اس نے چاندی کے سکّوں کو "روپا رُپیا" اور تانبے کے سکّوں کو "تامر رُپیا" لکھا ہے۔ ویسے یہ سکّے جن کا ذکر چانکیہ نے کیا ہے شاید درباری سکّے نہیں تھے، حکومت صرف ان کی دھات اور ان کے وزن کی جانچ پڑتال کرتی تھی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شیر شاہ نے اپنے ایک تولہ چاندی کے سکّے کو "روپیہ" نام دیا۔ پھر اس کو سولہ حصّوں میں بھی تقسیم کیا — ابھی میری وہ شکل اتنی پُرانی تو نہیں ہوئی کہ تم اسے بالکل ہی بھول گئے ہو —! ایک روپے میں سولہ آنے اور ایک آنے میں چار پیسے ہوتے تھے۔ اس طرح چونسٹھ پیسوں میں ایک روپیہ بنتا تھا۔

تاریخ کے عالم تو یہی کہتے ہیں کہ اس لفظ "آنے" کا استعمال بھی اسی زمانے میں شروع ہوا۔ اب نہ معلوم یہ نام کس نے دیا۔ ویسے تم ایک نام پہلے بھی اس سے ملتا جُلتا سُن چکے ہو — "پانا"۔

تانبے کا ایک اور سکّہ بھی شیر شاہ نے چلایا تھا — "دام" یہ تانبے کا سب سے کم قیمت کا سکّہ تھا — اب تم اس لفظ 'دام' کو ایک

اور طرح استعمال کرتے ہو۔ دکان دار سے پوچھتے ہو "یہ کاپی کتنے دام کی ہے؟" ممکن ہے لوگ پہلے بھی اسی طرح پوچھتے ہوں۔ مگر اس وقت ان کے ذہن میں کوئی خاص سکہ دام کے نام کا ہوتا ہو—!

دیکھا تم نے! اس بادشاہ نے اپنے سکوں کو ایسے نام دیے تھے کہ آج جب اس کی حکومت کو ختم ہوئے بھی کئی سو سال ہو گئے ہیں تب بھی نہ صرف اس کے اپنے ملک کے سکے کا نام "روپیہ" ہے بلکہ دنیا بھر میں کئی ملک ایسے ہیں جہاں یہی نام چلتا ہے۔

مگر شیر شاہ کے بعد اس کے جانشین اتنے قابل نہ تھے۔ چناں چہ ہمایوں جو کچھ سال پہلے ایران کی طرف بھاگ گیا تھا وہ پھر لوٹ آیا اور دہلی پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد سے ہندستان کی تاریخ کا پھر وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جسے 'سنہرا زمانہ' کہتے ہیں۔ اس زمانے کی یادگاریں کشمیر میں شالامار باغ، دہلی میں لال قلعہ اور جامع مسجد اور آگرے میں قلعہ، فتح پور سیکری، سکندرا تاج محل وغیرہ خوب صورتی کے بے مثال نمونے ہیں۔

اکبر کا خوب صورت سکہ

مغل زمانے کے سکوں کی ابتدا ایک طرح سے اس دن سے ہوتی ہے جس دن اکبر تخت پر بیٹھا۔

اکبر اور جہاں گیر نے اپنے زمانے میں بہت خوب صورت سکے چلائے۔ اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہاں کے سکے دنیا کے خوب صورت ترین سکوں میں گنے جاتے ہیں۔

جہاں گیر نے اپنی بیوی نور جہاں کو بھی اجازت دے دی تھی کہ وہ بھی اپنے نام سے سکے چلائے ___ اس طرح شاید ہمارے ملک میں تیسری یہ دوسری شکل تھی جس پر کسی عورت کا نام آیا۔ پہلا سکہ رضیہ سلطانہ کا تھا جس نے ہندستان پر ۱۲۳۶ء سے ۱۲۴۰ء تک حکومت کی اور دوسرا نور جہاں کا جو خود تو بادشاہ نہ تھی مگر بادشاہ نے اُسے اپنے نام سے سکہ چلانے کی اجازت دے دی تھی۔

اکبر نے اپنے سکوں پر جان دار چیزوں کی تصویریں بنوائیں اور جہاں گیر نے خود اپنی تصویر بھی سکوں پر بنوانی شروع کر دی۔

اس زمانے میں مہر پر بادشاہ کا پورا نام، القاب، سنہ، ٹکسال والے شہر کا نام، اور خوب صورت بیل بوٹے نظر آتے ہیں۔

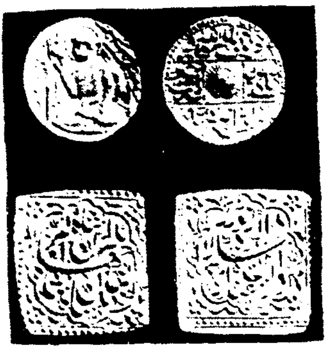

جہاں گیر کے خوب صورت سکے

اس کے علاوہ ایک خاص بات یہ تھی کہ اکبر نے بہت سے شہروں میں شاہی ٹکسالیں کھلوادی تھیں۔ جو شخص چاہتا اپنی دھات لے جاتا، سرکاری ملازم اس دھات کو پرکھتے اور اس کا سکہ ڈھال دیتے

اس سے پہلے بھی تم سُن چکے ہو کہ اکبر کے سکوں میں ایک سکہ ایسا تھا جس کا وزن ۱۰۱ تولے ___ یا ایک کلوگرام کے قریب ہوتا تھا۔ اب ایک اور سکے کا وزن بھی سن لو یہ سکہ اکبر نے اپنے دربار میں آئے ہوئے کسی سفیر کو دیا تھا۔ اس کا وزن

دو ہزار تولے ــ یا ایک بھگ پچیس سیر ــ تھا۔ مگر بھائی ایسا بھی کیا سکّہ جسے اٹھا کر آدمی آسانی سے چل بھی نہ سکے۔ اور اصل میں یہ سکّہ تھا بھی نہیں ــ یہ تو ایک تحفہ تھا۔

اور چھوٹے سے چھوٹا اکبر کا سونے کا سکّہ ایک تولے کے سویں حصّے سے بھی کچھ کم ہوتا تھا ــ خیر سونے کے متعلق تو میں نے تمھیں بتا ہی دیا ہے کہ ایسی نرم مزاج دھات ہے کہ اتنا چھوٹا سکّہ بن جانا کوئی تعجب کی بات نہیں!

مغل بادشاہوں کو بیرے عجیب عجیب مگر خوب صورت نام رکھنے کا بھی شوق تھا ــ چناں چہ "نور افشاں"، "خیر قبول" اور "شاہ رخی" جیسے نام انہی کے دیے ہوئے ہیں۔ تانبے کے سکّوں کو "رائج" اور "روانی" جیسے نام ملے۔ اس زمانے کا سب سے کم قیمت کا سکّہ شاید "دمڑی" ہوگا جو شیر شاہی روپے میں تین سو بیس آتی تھیں۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوتی تو "دمڑی" کو بھی کوڑیوں سے بھنایا جا سکتا تھا۔

اکبر نے اپنے بعض سکّوں میں اعشاریہ کا وہ طریقہ بھی شروع کرنے کی کوشش کی تھی جو ہمارے ملک میں ابھی کچھ دن پہلے شروع کیا گیا ہے ــ اس نے ایک نیا سکّہ چلایا جس کا نام "ٹنکہ" ہی تھا لیکن یہ نیا 'ٹنکا' پہلے 'ٹنکے' سے تین گنے سے بھی کچھ زیادہ ہوتا تھا، اور اس میں ساڑھے تین تولے سونا لگتا تھا۔ اس کے بعد سونے کے ہی چھوٹے سکّے ہوتے تھے جن کا نام 'ٹنکی' ہوتا تھا۔ اس طرح دس 'ٹنکیاں' ایک 'اکبری ٹنکے' کے برابر ہوتی تھیں۔

مگر ہمارے ملک میں تو اکبر سے پہلے بھی، بہت پرانے زمانے میں کچھ بادشاہوں نے اپنے سکّوں کو دس دس ٹکڑوں میں تقسیم کرنے

کی کوشش کی تھی۔

اکبر کے زمانے کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی حکومت میں کچھ نہیں کچھ نہیں تو چالیس سکے چلائے تھے۔

اور بھائی میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ میرا عروج اور زوال بادشاہوں کے ساتھ چلتا تھا۔ چناں چہ اِدھر مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا اور اُدھر میری صورت بگڑی ـــ میری شکلیں خراب ہوئیں۔ میرے لیے خراب اور گھٹیا دھاتیں استعمال ہوئیں، میری شکل میں وہ خوب صورتی اور میری بناوٹ میں وہ بانکپن نہ رہا جو مجھے اکبر اور جہاں گیر نے بخشا تھا ـــ نئی نئی اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنتی گئیں، اور یہ اپنے بس بھر سکے بھی چلاتی رہیں ـــ مگر تم جانو، جیسا راجہ ویسا سکہ!

اور پھر ایک وقت تو اتنی پریشانی کا آیا کہ تاریخ والوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ۹۹۴ قسم کے سکے بازاروں میں نظر آتے تھے ـــ ان میں نئے بھی تھے اور پرانے بھی، اچھے سونے کے بھی اور خراب سونے کے بھی ـــ اب تم سوچو کہ جب میرے ایک ہزار بھائی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوں تو ان کو لین دین میں کتنی مشکل پڑتی ہوگی ـــ!

بس صاحب! اس کے بعد انگریزوں نے ہمارے ملک پر قبضہ جمانا شروع کر دیا ـــ پہلے ایک کمپنی کے نام سے، جس کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ وہ ہندستان میں صرف تجارت کرنا چاہتی ہے۔ اس کا نام تھا 'ایسٹ انڈیا کمپنی'، اور پھر ۱۸۵۷ء میں تو مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے ساتھ دوسرے آزادی چاہنے والے ہندستانیوں

کو قید کیا، پھانسیاں دیں، اور انگریزوں نے باقاعدہ ہندستان پر راج کرنا شروع کر دیا۔

فرخ سیر بادشاہ نے، جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک راج کرتا تھا سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بمبئی میں ٹکسال کھولنے کی اجازت دی اور اس میں اپنے سکے ڈھلوائے۔ بعد میں جب مغل بادشاہ صرف نام ہی کے بادشاہ رہ گئے تو محمد شاہ نے خود اس کمپنی کو بھی اپنے سکے ڈھالنے کی اجازت دے دی۔ مگر ابھی کچھ عرصے تک سکوں پر مغل بادشاہ کا نام آتا رہا۔ لیکن ۱۸۳۵ء میں باقاعدہ انگریزی سکے ہندستان میں آگئے اور پرانے بادشاہوں کے تمام ہندستانی سکے چلنا بند ہو گئے۔

اور میری یہ شکلیں تو تم نے خود بھی دیکھی ہیں۔ ان کے بارے میں میں تمھیں کیا بتاؤں؟ بس دو چار باتیں نئی ہو سکتی ہیں وہ بتائے دیتا ہوں۔

تم نے تو بس روپیہ اور آنے سے لے کر بہت ہوا تو سو روپیے تک کے نوٹ دیکھے ہوں گے مگر اب سے کوئی تیس[۳۰] چالیس[۴۰] سال پہلے تک ایک، دو، پانچ، دس اور سو روپیے کے نوٹوں کے علاوہ ڈھائی، بیس، پچاس، ایک ہزار اور دس ہزار روپیے کے نوٹ چلتے تھے۔

روپیے سے نیچے اٹھنی، چونی، اکنی، اور دو پیسے کا ادھنا اور پیسہ ۔۔ پھر پیسے کا آدھا دھیلا اور ایک تہائی، 'پائی' چلتی تھی ۔۔ سب سے چھوٹے سکے پائی کے بعد بھی پیسے کے اگر اور چھوٹے ٹکڑوں کی ضرورت پیش آتی تو انہی 'کوڑیوں' سے کام چلتا جو ہمیشہ سے اسی کام میں آتی رہی ہیں۔

اور ہاں ! تم نے ایک پیسے کا وہ سکّہ بھی تو دیکھا ہوگا جس میں سوراخ ہوا کرتا تھا۔ یہ سوراخ والا سکّہ خود ہندستان کے لیے بھی کوئی نئی بات نہیں تھی ۔ اس قسم کا سوراخ والا سکّہ شاید سب سے پُرانا تو چین کے سکوں میں ملتا ہے ، جو وہاں اب سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے چلتے تھے ان میں سوراخ شاید اس لیے کیے جاتے تھے کہ ان میں تاگا پروکر بہت سے سکوں کو ایک ساتھ رکھا جا سکے ۔ لیکن خود ہندستان میں بھی بعض بعض چھوٹے سکوں میں ، اس انگریز کے زمانے کے سوراخ والے سکے سے پہلے ، سوراخ رکھا جاتا تھا۔

آج کی شکل

بس بھائی! ختم ہوئی میری کہانی۔ بس اب تو میں تمھیں اپنی وہ صورتیں اور دکھلا دوں جو آزاد ملک میں تم نے مجھے دی ہیں۔

انگریزوں کے آنے کے بعد سے جو کچھ ہوا وہ تم بہت سی کتابوں میں بھی پڑھ لیتے ہو ــــ ۱۹۴۷ء میں انگریز چلے گئے، ملک آزاد ہو گیا۔ مگر تم جانو کسی ملک میں مجھے ایک دم بدل دینا بھی اتنا آسان نہیں ــــ پھر بھی آزاد ہندستان میں مجھے آزاد ہندستانی کی شکل دینے میں زیادہ دیر نہیں کی گئی۔

۱۹۵۵ء میں ہمارے ملک کی پارلیمنٹ نے میرے لیے یہ قانون پاس کیا کہ مجھے نئی شکل دے دی جائے۔ میری صرف دو شکلیں ہوں ــــ "پیسہ" اور سو پیسوں کا "روپیہ"۔

'پیسہ' لفظ بھی بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ یہ کس زبان سے لیا گیا ہے مگر اس سے ملتا جلتا ایک اور لفظ سات آٹھ سو سال پہلے بھی کچھ اس سے ملتے جلتے معنوں ہی میں استعمال ہوا تھا ــــ قبلائی خان نے جس کا نام تم سن چکے ہو، مارکو پولو کو سونے کی ایک چھوٹی سی تختی دی تھی جس کا نام تھا "پیزہ"۔

اب بھائی پتہ نہیں کہ آج کا یہ "پیسہ" کہیں اسی "پیرشہ" کا رشتہ دار تو نہیں؟ ویسے ہندستان کے علاوہ دنیا کے لگ بھگ آٹھ ملکوں میں سکوں کا نام 'پیسہ' سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اسی طرح سات آٹھ ملک ایسے بھی ہیں جہاں میرا نام یا تو روپیہ ہی ہے یا اس سے ملتا جلتا کوئی لفظ ہے۔

۱۹۵۷ء سے پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون پر عمل شروع ہوا اور میری پرانی شکلیں بدلنی شروع ہوئیں اور اب میرا نیا روپ تمہارے سامنے ہے۔

اس وقت میری جو صورتیں تمہارے ہاتھوں میں آتی ہیں ان کے متعلق بھی تمہیں تھوڑا سا بتا دوں۔

میری دھات والی شکلوں میں اس وقت سب سے بڑی شکل ایک روپیہ یا سَو پیسے کے سکے کی ہے۔ یہ وزن میں ۱۰ گرام ہوتا ہے۔ اس کے بعد پچاس پیسے کا سکہ ہے، یہ پانچ گرام کا ہوتا ہے اور پچیس پیسے والا ڈھائی گرام کا۔ یہ تینوں سکے خالص نکل دھات سے بنائے جاتے ہیں۔

ان بڑے سکوں کے بعد ایک سنہری، بہت خوب صورت سا بیس پیسے کا سکہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد دس پیسوں کے دو قسم کے سکے ہیں۔ ایک ذرا چھوٹا اور ایک کچھ بڑا۔ دس پیسے کے چھوٹے سکے میں سفید بھی ہیں اور سنہری بھی۔ پھر پانچ اور تین پیسے کے سکے ہیں۔ دو پیسے کے دو قسم کے سکے اور آخر میں ایک پیسے کا ایک گول اور ایک چوکور سکہ ہے۔ نکل کے علاوہ جو خاص خاص دھاتیں آج کل ہمارے سکوں

کے بنانے میں کام میں لائی جاتی ہیں وہ ہیں :- برونز، الونیم، لوہا، زنک اور ایک اور مرکب دھات ۔کیپرونکل۔

نوٹوں میں آج کل ایک روپیہ، دو روپیے، پانچ روپیے، دس روپے، بیس روپیے، سو روپیے ایک ہزار، پانچ ہزار اور دس ہزار روپیے کے نوٹ ہندوستان میں چلتے ہیں۔

— لو بھائی! تو یہ تھی میری کہانی، جو نہ معلوم کب سے شروع ہو کر بالکل تمھارے وقت تک آکر ختم ہو گئی۔ لیکن مجھے پتہ ہے کہ میری کہانی کبھی پوری نہیں ہوگی، چوں کہ یہ تو خود انسان کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

اب اگر تم چاہتے ہو کہ میری پُرانی پُرانی شکلیں خود دیکھو تو ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں جو میوزیم یا عجائب گھر ہیں وہاں چلے جاؤ، میری یہ شکلیں وہاں موجود ہیں۔

اور پھر اگر کوشش کرو تو تم خود بھی پُرانے پُرانے سکے جمع کر سکتے ہو۔ دیکھیں تمھارے پاس میری کتنی پُرانی شکلیں جمع ہو جاتی ہیں —!

مگر بھائی تم ٹھہرے خوب صورت خوب صورت سکوں اور اچھے اچھے نوٹوں کے استعمال کرنے والے — نہ معلوم تمھیں میری پُرانی ٹیڑھی ترچھی شکلیں پسند بھی آئیں گی یا نہیں —!!